ماہنامہ

# آنکھ مچولی

کراچی

ستمبر ۱۹۸۹ء

کِس نے کِس کی نقل اُتاری
بولو کیا ہے رائے تمہاری

پانچ ہزار روپے بطور اسکالرشپ حاصل کیجیے

تفصیل صفحہ نمبر ۳ پر دیکھیے

حصول علم اور فروغ علم کے لیے
آنکھ مچولی اسکالرشپ حاصل کیجئے
۵۰۰۰ روپے
بطورِ اسکالرشپ
۵ ر خوش نصیب طالبانِ علم کے لئے
ایک ایک ہزار روپے کی پانچ اسکالرشپ
علم کی راہوں کو آسان سے آسان تر بنانے کے لئے
آنکھ مچولی کا فخریہ اعلان
تفصیلات سامنے پڑھیے
لکھئے
پڑھئے
آگے بڑھئے

# آنکھ مچولی کا انعام

## طالب علموں کے نام

ہم نے روزِ اوّل ھی سے آنکھ مچولی کے سفر کو تحریک فروغ علم کا نام دیا
فروغِ علم کی یہ تحریک آج بھی جاری ہے کاروانِ شوق ابھی سرگرمِ سفر ہے

۵۰۰۰ روپے کی خطیر رقم سے اسکالرشپ دینے کی جو روایت ہم نے ڈالی ہے
امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

اسکالرشپ کے حصول کے لئے درج ذیل شرائط بغور پڑھ لیجئے

- اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے اسکول یا کالج کا طالبعلم ہونا شرط ہے۔
- ضروری ہے کہ نیچے دیا ہُوا کوپن ۲۰ ستمبر سے قبل ہمیں موصول ہو جائے۔
- قرعہ اندازی کے ذریعہ اسکالرشپ حاصل کرنے والے پانچ خوش نصیب طلبا کے نام نومبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔ یاد رہے کہ فی طالب علم ایک ہزار روپے دیئے جائیں گے۔
- خوش نصیب طلبا کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے سے اپنے طالب علم ہونے کا صداقت نامہ ہمیں بھجوائیں۔
- اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسکالرشپ کے لیے کوئی طالب علم آپ سے بھی زیادہ موزوں ہے تو اپنے بزرگوں کے مشورے سے یہ کوپن اُس کے نام سے پُر کر دیجئے۔ آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر کہلائے گا۔

نام ............ ولدیّت ............
کلاس ............ اسکول / کالج ............
پتہ ............

B-3-87
ASIATIC

ABC آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

# آنکھ مچولی

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیر مسئول تجمل حسین چشتی

مُشاورت مُشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت شاہ نواز فاروقی، سید خورشید عالم

خطّاطی عارف سعید

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸

- ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ھیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
- ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ھیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ھوگا۔
- ماھنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذھنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۴ شمارہ ۳ ستمبر ۱۹۸۹ء صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے، ۷ درہم، ۷ ریال
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

خصوصی بچت اسکیم

# آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
# کتنے سستے کتنے پیارے

دسمبر ۱۹۸۹ء سے
قبل ممبرشپ حاصل کرنے
والوں کے لیئے مہماتی
کہانیوں کی خوبصورت
کتاب "حق اسکواڈ" کا
تحفہ بالکل مُفت

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

**آنکھ مچولی** کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبرشپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

۱۵۰ روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف علیحدہ کاغذ پر لکھ کر روانہ کریں۔
(۱) خریدار کا نام (۲) مکمل پتا (۳) فون نمبر اگر ہو (۴) رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے۔ (۵) دستخط

**سالانہ ممبرشپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ڈی سائٹ کراچی**

# حُسنِ ترتیب


۸ حمد

۹ اداریہ

۱۰ ڈاکیہ ڈاک لایا

۱۳ اے وطن (نظم) پروفیسر عنایت علی خان

۱۴ انجانی مہم امجد اسلام امجد

۱۸ مصوّر چمپینزی سیّد وجاہت علی

۲۱ واپسی شاھنواز فاروقی

۲۷ نینا اور بگ مین سیّد خورشید عالم

۳۱ کامیابی کے سات اصول محمد صالح ارشاد

۳۶ کار ہے یا جہاز ہے کیا ہے جنید شمیم

۳۹ مچھیرے کی کہانی ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۵ ہماری نیند ہمارے خواب شین فاروقی

۴۹ دھاڑیل نعیم بلوچ (پہلی قسط)

۵۴ چھپرے بھی کھائیں جُوتے بھی کھائیں سلمیٰ سلیم

۵۷ کھٹے میٹھے (منتخب لطائف)

۶۱ جب ہم چھوٹے تھے رفعت ھمایوں

۶۴ بدنصیب مجیب ظفر انوار

۶۸ بہن کی دُعا سیّد نظر زیدی

۷۳ پہاڑوں پہ جو ڈالتے ہیں کمند سعدیہ جمیل

۷۷ وعدہ محمد سلیم مُغل

۸۳ آخری خواب سلمان غزالی

۸۷ جستجو شرط ہے اسامہ بن سلیم

۹۱ پُراسرار آواز طاہر مسعود

۹۶ کاش (نظم) شاھنواز فاروقی

۹۸ یہ بچّہ کس کا ہے حنیف سحر

۱۰۵ ایک لڈو (نظم) حاطب صدّیقی

۱۰۷ صبر (نظم) شبیر بیگ ناز

۱۰۹ اندھی دنیا عامر یونس

۱۱۵ نیا سفر مصطفیٰ چاند

۱۲۹ سائنس انکوائری ایان محمود

۱۳۲ حرفوں کے گورکھ دھندے محمد عظیم مغل

۱۳۳ سانپ رے سانپ ساجد سعید

۱۳۶ گُنی چُنی معلومات عقیل عباس جعفری

۱۳۹ ننھّی نگارشات

۱۵۲ سالگرہ کے ساتھی (قلمی دوستی)

۱۵۴ امّی ابو کا صفحہ

# تاریخ کے دریچے سے

امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں دو شخص ایک اہلِ عرب کو پکڑ لائے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے والد کو مار ڈالا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُس سے پُوچھا تو اُس نے اِقرار کر لیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اب تُو قتل کیا جائے گا۔ مجُرم بولا بہتر۔ لیکن میرے پاس ایک یتیم کا مال ہے۔ میں اُس کو اُس کے وارث کے سپرُد کر آؤں۔ آپ نے ضامن مانگا۔ مجُرم نے اصحابِ کرامؓ کی طرف نظر کر کے حضرت ابوذر صحابیؓ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ میری ضمانت دیں گے۔ حضرت ابوذرؓ نے منظور کر لیا خیر وہ شخص تین روز کے وعدے پر چلا گیا۔ مگر تیسرے روز وقتِ مقرّرہ پر وہ نہ آسکا۔ اور مُدّعی آکر اپنا قاتل مانگنے لگے۔ تو امیرالمؤمنین نے فرمایا۔ ابوذرؓ! اب تم اُس کی جگہ قتل کیے جاؤ گے۔ غرض حضرت ابوذرؓ کو قتل کرنے کے لیے لے چلے کہ اتنے میں وہ مجُرم نہایت زور سے ہانپتا ہُوا دُور سے آتا دکھائی دیا اور تھوڑی دیر میں پاس آ پہنچا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ اُس کو دیر ہو گئی تھی اور وہ اس خیال سے دوڑتا ہُوا آیا ہے کہ کہیں مسلمانوں پر یہ دھبّا نہ آجائے کہ مسلمان وعدہ پُورا نہیں کرتے۔ حضرت ابوذرؓ بولے واللہ میں اس شخص کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ لیکن چونکہ اُس نے مجھ پر امید کر کے مجھ کو ضمانت کے لیے کہا تھا۔ اس لیے میں نے اس کی ضمانت دی کہ کہیں یہ نہ کہا جائے کہ مسلمان ایک دوسرے کے ہمدرد نہیں ہوتے۔ یہ سُن کر دونوں مُدّعی بولے کہ ہم نے اس شخص کو اللہ کے واسطے معاف کیا۔ کہیں مسلمانوں کے نام پر یہ دھبّا نہ آئے کہ وہ ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے۔

اداریہ

## ماہِ رواں کی پہلی بات

آنکھ مچولی آج اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ پچھلے تین سال اس کی زندگی کا پہلا دور ہیں جس میں یہ جاری ہُوا، پھلا پھُولا اور مقبول ہُوا۔ ایک رسالے کی زندگی میں تین سال کچھ بھی نہیں ہوتے۔ لیکن اپنے پڑھنے والوں کی محبت، پسندیدگی اور اعتماد کی وجہ سے آنکھ مچولی نے اس مختصر سی مدت میں وہ کامیابیاں حاصل کیں جو اکثر رسالوں کو برسوں میں نصیب نہیں ہوتیں۔ آنکھ مچولی اس عزت و مقبولیت پر خدائے ربّ العزّت کا شکر گزار ہے۔

آنکھ مچولی جب نکلا تو اس کے صفحات بھی کم تھے قیمت بھی کم تھی۔ یہ تو سفر کی محض ابتدا تھی اور جب سفر آگے بڑھا تو آپ نے دیکھا کہ اس رسالے نے بچّوں کی صحافت میں نئی اور شاندار روایات قائم کیں۔ ان روایات کو قائم کرنے میں رسالے کو مالی اعتبار سے ہمیشہ گھاٹا ہُوا لیکن آنکھ مچولی کے نزدیک یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا۔ یہ اپنے پڑھنے والوں سے محبت اور ان کی ضرورت کا تقاضا تھا۔

کہنے کی بات تو نہیں لیکن آپ بھی اتفاق کریں گے کہ شاید ہی کسی رسالے نے اتنی مختصر مدت میں اتنے خصوصی اور موضوعاتی شمارے نکالے ہوں، شاید ہی کسی نے اتنے تحائف اپنے پڑھنے والوں کو دیئے ہوں، شاید کسی رسالے کے لکھنے والوں کو اتنا معاوضہ دیا جاتا ہو، شاید ہی کوئی رسالہ اپنے مزاج، زبان و بیان اور مواد کے لحاظ سے اتنا مختلف و منفرد ہو۔ آنکھ مچولی اپنے معیار کو بڑھانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ اس نے ہر اچھی تجویز اور نیک مشوروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں کی خواہشات کا احترام اور ان کی پسند کو اپنی پسند پر فوقیت دی ہے۔ کبھی کوئی ایسی تجویز بھی آئی جس میں رسالے کا بھلا ہوتا ہو لیکن اخراجات میں اضافہ ہو تو اس نے ہمیشہ رسالے کا بھلا چاہا "رسالہ اچھا تو سب اچھا" یہی ہماری پالیسی رہی۔ ہم نے اپنا ذاتی نام و نمود کبھی نہیں چاہا۔ رسالے کو اپنی شہرت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔

اب جبکہ آنکھ مچولی کی عمر تین سال ہونے کو آئی ہے۔ حالات بہت بدل چکے ہیں۔ کاغذ میں آگ لگی ہوئی ہے جس میں سبھی جُھلس رہے ہیں۔ اس مہنگائی کا مقابلہ کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ رسالے کی کتابت، طباعت اور کاغذ کے معیار میں کمی کر دی جاتی تاکہ اخراجات گھٹ جائیں اور ساتھیوں کو جو تحفے تحائف اور انعامات دیئے جاتے ہیں اس سلسلے کو بھی ختم کر دیا جاتا لیکن پھر آنکھ مچولی، آنکھ مچولی تو نہ رہتا۔ پس ہم نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوں۔ نئے گیٹ اپ، نئے انداز نئے خیال اور نت نئی دلچسپیوں کے ساتھ رسالے کو اتنے صفحات پر شائع کیا جائے کہ آپ کو یہ بالکل نیا رسالہ محسوس ہو بے شک رسالے کی قیمت بڑھ گئی ہے لیکن قیمت بڑھائے بغیر رسالے کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اب یہ بات آپ کے سمجھنے کی ہے اور اپنے والدین کو سمجھانے کی ہے کہ ذہن کی تہذیب و تربیت کے سامنے دس روپے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ رسالے کی نئی تبدیلیوں کے متعلق آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

**ناصر محمد ۔ ھنگو** میں آپ سے بہت ناراض ہوں ۔ دوست میرا مذاق اُڑاتے ہیں کہ تم نے کتنی تحریریں بھیجیں ایک بھی شائع نہ ہوئی ۔ میں نے کتنے خط اور لطیفے بھیجے آپ نے ایک بھی نہیں چھاپے ۔ قلمی دوستی کے لیے تصویر بھیج دوں آپ سے کھو تو نہیں جائے گا؟

● ناصر میاں! غصّہ تھوک دیجیے ۔ کیا آپ کے دوستوں کو اندازہ ہے کہ آنکھ مچولی میں کتنی ڈاک آتی ہے ؛ اتنی زیادہ کہ اگر ایک مہینے کے خطوط، مضامین وغیرہ ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو اتنا انبار اکٹھا ہو جاتا ہے کہ آپ کے دوست چھلانگ لگائیں تو اُس میں ڈوب جائیں ۔ جب آپ کے خط کا جواب نہ ملے تو سمجھیے کہ ہم ان دنوں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ نظم چونکہ چھپی ہوئی ہے ۔ اس لئے نہیں چھپ سکتی ۔

**لُبنیٰ اقبال ، لاھور :** اگست کا شمارہ پسند آیا ۔ برائے مہربانی "شاعرانہ روشنائی" جیسی بے مقصد کہانیاں شائع نہ کیا کیجیے ۔ میں آپ کے لیے مستقل لکھنا چاہتی ہوں کیا آپ معاوضہ دیتے ہیں ؟

"شاعرانہ روشنائی" کے متعلق سرگودھا سے شازیہ گُل لکھتی ہیں : "بھائی شاہنواز کو ان کی مزاحیہ کہانی "شاعرانہ روشنائی" کے لکھنے پر مبارک باد ضرور ملنی چاہیے ۔"

● واضح رہے کہ یہ ہم نے صرف ایک خط کا حوالہ دیا ہے ۔ آنکھ مچولی غالباً بچّوں کا واحد رسالہ ہے جس نے اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ دینے کی روایت قائم کی ہے ۔

**قیصر محمود ، مانسہرہ** قرعہ اندازی کے نتائج دیکھے لیکن مایوسی ہمارا مذاق اُڑا رہی تھی ۔ مرتے کیا نہ کرتے رسالے کو پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور آئندہ قرعہ اندازی کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئے ۔

● ہم نہیں چاہتے کہ خدانخواستہ آپ آئندہ بھی مایوس ہوں اس لیے فی الحال دوبارہ قرعہ اندازی کا کوئی ارادہ نہیں ۔

# ڈاکیا ڈاک لایا

## ایک ضروری وضاحت

اکثر ساتھی اپنے خطوں میں پوچھتے ہیں۔

- "انکل! کیا میں اپنی کہانی بھجوادوں؟"
- "میں نے ایک مضمون فلاں موضوع پر لکھا ہے کیا چھپ جائے گی؟"

اس طرح کے خطوط لکھنے والے تمام ساتھی ذہن نشین کرلیں کہ ادارے کی طرف سے مضامین کہانیاں، نظمیں، لطیفے وغیرہ بھیجنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے لیے پہلے سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی بھی تحریر کے چھپنے کا فیصلہ اُسے پڑھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی ساتھی اپنی تحریر کے متعلق فوراً جواب چاہتے ہوں تو انہیں جوابی لفافہ بھیجنا چاہیے تاکہ اُنہیں فیصلے سے آگاہ کیا جاسکے۔ (ادارہ)

**محمد بن مالک، دستگیر کالونی کراچی** آپ یہ اعلان کیوں نہیں کرادیتے کہ آئندہ صرف ان لوگوں کے خطوط شامل کیئے جائیں گے جو آنکھ مچولی پر بھرپور تبصرے کریں گے یا کوئی مفید تجویز دیں گے۔

● میرے بھائی! ایسے اعلانات کئی بار کیے جاچکے ہیں لیکن ہمارے پیارے پیارے ساتھی خط لکھتے ہوئے ہربار بھول جاتے ہیں۔

**نورالصباح سعید، کوئٹہ** قہقہہ نمبر پڑھ کر اتنی ہنسی آئی کہ میرے خون میں دو جگ کا اضافہ ہوگیا پھر پتہ چلا کہ سول اسپتال میں خون کی ضرورت ہے میں وہاں گئی اور میرا گروپ مل گیا۔ میں نے خون دے دیا۔ کچھ تو فائدہ ہوا قہقہہ نمبر کا۔

● معلوم نہیں یہ واقعہ آپ نے مذاق میں لکھا ہے یا واقعی پیش آیا۔ اگر یہ مذاق ہے تو بھئی یہ بڑا المناک مذاق ہے اور یہ اگر سچا ہے تو آپ کو ہم خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

**رفیق زاھد، گوادر** جب میں بچّوں کے دوسرے رسالے پڑھتا تھا تو دسویں جماعت کے لڑکے مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ اتنے بڑے ہوکر بھی آنکھ مچولی پڑھتے ہو لیکن اب میں سیکنڈ ایئر میں آگیا ہوں اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ آنکھ مچولی کیوں پڑھتے ہو؟ اس کے برعکس میری تحریک پر دو تین لڑکوں نے بھی آنکھ مچولی پڑھنا شروع کردیا ہے۔

● آنکھ مچولی بیک وقت بچّوں اور بڑے بچّوں کا رسالہ ہے۔ اس لیے ہم انہیں "بچّے" سے زیادہ "ساتھی" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ چونکہ آپ سب آنکھ مچولی کے دوست ہیں۔ اس لیے آپ کے دوستوں کی بھی آنکھ مچولی سے دوستی ہوگئی۔

**عامر زیدی، حیدرآباد** آنکھ مچولی میں کہانیوں کی تعداد بڑھادی جائے تو لکھنے والوں کو زیادہ مواقع مل جائیں گے۔ خطوط زیادہ سے زیادہ شائع کیجیے۔

● رسالے میں کہانیاں تو پہلے ہی بہت ہوتی ہیں۔ جو ساتھی لکھنا چاہتے ہیں وہ کہانی کے علاوہ بھی چیزیں بھیج سکتے ہیں۔ خطوط کے صفحات میں مزید اضافہ ممکن نہیں ہے۔

**نوین اسلم، فیصل آباد** آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے کہ اس دفعہ اگست کے شمارے میں میری ڈائری کا مضمون کیوں نہیں شائع کیا گیا؟

● بھئی 'میری ڈائری' کے لئے آپ لوگوں کی طرف سے دلچسپ اقتباسات وغیرہ نہیں آرہے تھے۔ لہٰذا ایک غیر دلچسپ کالم چھاپنے سے بہتر تھا کہ اُس کی جگہ کوئی زیادہ بہتر چیز چھاپی جائے۔ کیوں؟

**سعدیہ یاسمین (؟)** انکل! اب آپ اسلامی کہانیاں رسالے میں شائع نہیں کرتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ہماری ایک تنظیم ہے "اچھی بہنیں" اس کا مقصد "نیک بنو نیکی پھیلاؤ" ہے۔ ہم انعامات اور تحائف کے لیے آپ ہی کے رسالے کو ترجیح دیتے ہیں۔

● سعدیہ بہن! ہم اسلامی معلومات کسی نہ کسی طریقے سے ضرور چھاپتے رہتے ہیں۔ جلدی ہی اس میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ آپ کی تنظیم ایک نیک مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔ خدا آپ کے حوصلے بلند رکھے اور کامیابی عطا کرے۔ (آمین)

**عظمیٰ ادریس، رامسوامی، کراچی** "جستجو شرط ہے" کا کوپن الگ سے دیا کریں کیونکہ کوپن نکالنے سے ہمارا رسالہ بدنما نظر آتا ہے۔ اس مرتبہ آنکھ مچولی کافی کمزور نظر آرہا ہے۔ امید ہے آئندہ آپ اس کی صحت کا خیال رکھیں گے۔

● آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے۔ رہا سوال آنکھ مچولی کی صحت کا تو بھئی کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے عینک کے بغیر آنکھ مچولی کو دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش کی ہو۔ چلیئے کوئی بات نہیں۔ اس مہینے آپ کو یقیناً آنکھ مچولی صحت مند نظر آرہا ہوگا۔

**شاہد رمضان، قائد آباد، لانڈھی** انکل کیا آنکھ مچولی کا اب ہر شمارہ دس روپے کا ہوگا۔ آخر آنکھ مچولی کی قیمت بڑھانے کا مقصد کیا ہے؟ جواب ضرور دیجئے گا۔

● آپ ٹھیک سمجھے قیمت اس مہینے سے دس روپے ہوگی۔ بات یہ ہے کہ جس کاغذ پر رسالہ چھپتا ہے نا اُس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ قیمت بڑھاتے ہوئے ہمیں خود بہت تکلیف ہوئی لیکن مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

**صادق علی، فیصل آباد** آپ کو جو بچے چوری کے لطیفے بھیجیں اُن کے نام بھی بلیک بکس میں شائع کر دیا کیجیے۔ کیونکہ اگر بچے نقل شدہ لطیفے بھیجتے رہیں گے تو رسالے کا معیار گر جائے گا۔

● آپ کے خیال میں بچے لطیفے خود سے گھڑ کر بھیجیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہاں بچوں کو گھسے پٹے اور مشہور لطیفے نہیں بھیجنے چاہئیں۔ اس حد تک ہم آپ کی تائید کرتے ہیں۔

## ایک اور سانحہ

ابھی محمد حسین مرحوم کا غم تازہ تھا کہ "آنکھ مچولی" کے آرٹسٹ سجاد احمد صدیقی بھی چل بسے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ صدیقی مرحوم ایک منجھے ہوئے تجربہ کار آرٹسٹ تھے۔ آنکھ مچولی کے علاوہ وہ دوسرے بہت سے رسالوں کے لیے بھی اسکیچز بنایا کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے انسان تھے اور اس کی سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ وہ وعدے کے پابند تھے۔ عام طور پر اُن کے پیشے کے لوگوں میں یہ خوبی مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔ صدیقی مرحوم نے ہمیشہ آنکھ مچولی کے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا۔ جب بھی اُن سے اچانک اسکیچ بنوانے کی ضرورت پڑ جاتی تھی تو وہ کھلے دل سے آنکھ مچولی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتے تھے۔ اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ادارتی عملے میں بہت مقبول تھے۔ ان کے اسکیچز بچوں میں پسند کیے جاتے تھے۔ موت ہر شخص کو آنی ہے لیکن اچھی موت وہی ہوتی ہے کہ لوگ مرنے والے کو اچھے لفظوں میں یاد کریں اور اس کی کمی ہمیشہ محسوس کریں۔ صدیقی مرحوم یاد آتے رہیں گے اور اُن کی کمی بھی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے (آمین)

# اے وطن!

پروفیسر عنایت علی خان

اے وطن پیارے وطن، چاند وطن تارے وطن
اے مرے پیارے وطن

میرے خوابوں کی زمیں ہے، مرا ارمان ہے تُو
میری ہستی کا مری زیست کا سامان ہے تُو
میری عزّت، مری عظمت، مری پہچان ہے تُو
حوصلوں کو مرے رکھتی ہے جواں تیری لگن
اے مرے پیارے وطن

تُو کہ اِک ماہِ مقدّس میں ہُوا تھا ضَوبار
اور اس نامِ مبارک پہ ہوں سو بار نثار
اُمّتِ احمدِ مُرسلؐ کے حصاروں کا حصار
میرے ماں باپ، مری جان، مرا تن من دھن
اے مرے پیارے وطن

لاکھ طوفان اُٹھیں تجھ کو مٹانے کے لئے
سَر کٹانے کے لئے جان لڑانے کے لئے
میں ہوُں موجُود ہر آفت سے بچانے کے لئے
تجھ پہ جو وار ہو جھیلے مرا فولاد بدن
اے مرے پیارے وطن

تیرے باشندے ہر اک خوف سے آزاد رہیں
سایۂ رحمتِ باری میں سدا شاد رہیں
کھیت سرسبز رہیں، بستیاں آباد رہیں
تیری اُلفت ہو ہر اک فرد کے دل کی دھڑکن
اے مرے پیارے وطن

# انجانی مُہم

امجد اسلام امجد

آنکھ مچولی کی فرمائش پر یہ کہانی آپ کے لیے مُلک کے مشہور شاعر ادیب اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد نے لکھی ہے۔ یہ کہانی تین مہم جو بچّوں کی ہے جو ایک زبردست مُہم انجام دینے کے لیے سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔ یہ مُہم کس قسم کی ہے؟ یہ بچے کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اُن کے ساتھ کیا واقعات پیش آنے والے ہیں۔ کہانی سے اُن باتوں کا پتا نہیں چلتا، اِس لیے کہ کہانی ابھی ادھوری ہے۔ چونکہ امجد اسلام امجد نے کہانی کو نامکمّل حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ اِس لیے ہم آنکھ مچولی کے ساتھیوں کو دعوتِ عام دیتے ہیں کہ وہ اِس کہانی کو آگے بڑھائیں۔ واضح رہے یہ کہانی سلسلے وار ہو گی۔ ہمیں اِس کی اگلی قسط کے لیے جتنی کہانیاں

مَوْصُول هوں گی اُن میں سب سے اچّھی کہانی کو دُوسری قسط کے طور پر شائع کیا جائے گا اور اِس طرح یہ سِلسلہ چار قسطوں تک چلتا رہے گا۔ البتّہ اِس کی پانچویں اور آخری قسط امجد اِسلام امجد صاحب لکھیں گے۔ لہٰذا اب یہ آپ کا کام ہے کہ امجد صاحب کی شروع ہوئی کہانی کو اِس خوبصورتی سے آگے بڑھائیں کہ اُنہیں آخری قسط لکھتے ہوئے مزہ آجائے۔ ہماری طرف سے آپ کو پُوری اِجازت ہے کہ اِس کہانی کو آپ جِس طرح چاہیں آگے بڑھائیں۔ اِس میں جو تبدیلیاں کرنا چاہیں کریں۔ شرط صِرف یہ ہے کہ کہانی دِلچسپ ہو، مزیدار ہو۔ جذبۂ حُبّ الوطنی سے معمُور ہو۔ کہانی بھجوانے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ہے۔

پلیٹ فارم پر بڑی بھیڑ تھی۔

سُرخ وردیاں پہنے قلی، کچھ سامان سر پہ اُٹھائے، کچھ بغل میں دبائے اور کچھ ہاتھوں میں لٹکائے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ لاہور جانے والی ٹرین کی روانگی میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ ٹرین کے آگے سبز رنگ کا انجن لگ چکا تھا اور اس میں سے چھگ چھگ چھگ چھگ کی آوازیں آرہی تھیں۔

ٹرین کی بوگیوں کی کھڑکیوں سے لوگ سر نکالے جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ان عزیزوں، رشتے داروں سے باتیں کررہے تھے جو اُنہیں خدا حافظ کہنے آئے ہوئے تھے۔

منصور، ذیشان اور صفدر ہاتھوں میں سوٹ کیس اُٹھائے جونہی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے، سُرخ لباس پہنے ہوئے ایک قلی تیزی سے لپکا۔

"لاؤ بابو جی" اُس نے منصور اور صفدر کے ہاتھوں سے سوٹ کیس لینے کی کوشش کی۔

"ہم اپنا سامان خود اُٹھاتے ہیں"، صفدر نے یہ کہہ کر آگے بڑھنا چاہا لیکن قلی تو جان کو آگیا۔

"جو مرضی میں آئے دے دینا، بابو جی" اُس نے ایک بار پھر منصور کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا۔ منصور کو غصہ آگیا۔

"تم زبردستی مجھ سے یہ سامان لوگے؟ کیا ہم تمہیں معذور نظر آرہے ہیں؟" منصور نے درشت لہجے میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کررہے ہو" صفدر نے نرمی سے کہا۔ قلی کو اپنی دال گلتی نظر نہ آئی تو وہاں سے سٹک لیا۔ تینوں دوست تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد اپنے کمپارٹمنٹ پہنچے تو یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُن کی برتھ پر پہلے ہی سے ایک بستر بند پھیلا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے اپنے سُوٹ کیس وہیں

رکھ دیئے اور احتیاطاً ایک بار پھر ٹکٹ نمبر چیک کیا۔ اُن سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔

"لیے یہ سوٹ کیس کس کے ہیں۔ ہٹائیں انھیں"۔ ایک کرخت آواز آئی۔ تینوں لڑکوں نے گھوم کر دیکھا ایک بڑے میاں جن کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی نچاتے ہوئے اُنھیں گھور رہے تھے۔

"محترم یہ برتھ اور نیچے کی تینوں سیٹیں ہماری ہیں"۔ صفدر نے نرمی سے کہا۔

"واہ! تمہاری کیسے ہو گئیں برخوردار، ابھی تو قلی کو سو روپے دے کر سامان رکھوایا ہے یہاں"۔

"قلی نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ یہ دیکھئے ہمارے ٹکٹ۔ یہ برتھ اور تینوں سیٹیں ریزرو ہیں"۔ منصور نے اپنی پتلون کی جیب سے ٹکٹ نکال کر بڑے میاں کے سامنے کر دیئے۔ بڑے میاں نے جیب سے چشمہ نکال کر پہنا۔ ٹکٹوں کو غور سے دیکھا۔ پھر بے بسی سے بولے۔

"میاں شرافت کا تو زمانہ ہی نہ رہا۔ اچھا بھئی قلی صاحب۔ تمہارا دامن تو قیامت میں پکڑوں گا"۔ پھر وہ عاجزی سے بولے "بیٹا اب ٹرین چھوٹنے ہی والی ہے۔ ابھی تو مجھے یہیں بیٹھنے دو۔ اگلے اسٹیشن پر کوشش کروں گا کہ کہیں جگہ مل جائے"۔

"کوئی بات نہیں آپ بیٹھیں۔ جگہ نکل ہی آئے گی"۔ منصور نے اُنھیں تسلی دی۔

یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا جس میں چھ برتھیں تھیں۔ نشستیں سب ہی بھری ہوئی تھیں۔ ان تینوں کے سامنے والی نشستوں پر ایک دُبلا پتلا شخص بیٹھا تھا جس کے سر پر چند ہی بال رہ گئے تھے۔ اُس کے برابر ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ جن کے منہ میں پان بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا، ذرا ذرا سی دیر میں وہ گردن بڑھا کر کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر پیک بوٹوں کا اضافہ کر دیتے اُن کے برابر ایک ادھیڑ عُمر کا شخص بیٹھا تھا جس نے اخبار کھول رکھا تھا۔ اُس نے سفید رنگ کی پتلون پر نیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ گرمی خاصی ہو گئی تھی۔ ڈبے میں بیٹھے تمام ہی لوگوں کے چہروں پر بیزاری طاری تھی۔ نیلے کوٹ والا اپنی پتلون کی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھ رہا تھا اور پان چبانے والے بزرگ بار بار پوچھتے تھے "بھئی اب کیا دیر ہے؟ ضرور انجن ڈرائیور صاحب چائے پینے یا قیلولہ کرنے گئے ہوئے ہوں گے"۔

خدا خدا کر کے گاڑی کو ایک دھچکا لگا اور انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پلیٹ فارم پر بہت سے ہاتھ اور رومال ہلنے لگے۔ اور پلیٹ فارم کے آہنی پُل، عمارتیں، خوانچے والے، سب ہی کچھ دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ نیلے کوٹ والا جلدی سے اُٹھ کر باتھ روم کی طرف لپکا۔ شاید وہ بہت دیر

سے گاڑی کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔
گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اب ڈبے میں موجود لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ منصور، ذیشان اور صفدر بھی اطمینان سے اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ دیر میں نیلے کوٹ والا، رومال سے ہاتھ پونچھتا ہُوا باتھ روم سے نکل آیا۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اُس نے تینوں لڑکوں کو ذرا غور سے دیکھا اور پھر مُسکرا کر بولا۔
"آپ لوگ شاید لاہور جا رہے ہیں؟"
"جی ہاں" منصور نے بھی مسکرا کر کہا "ہمارے خالو وہاں رہتے ہیں"
"چھٹیاں گزارنے جا رہے ہوں گے؟"
"یہی سمجھ لیجیے۔ لاہور اور پھر آگے پنڈی، مری وغیرہ سیر و تفریح و کا پروگرام ہے"
"بہت خوب، پنڈی تو سمجھیے میرا گھر ہے۔ میرا نام راجہ سلیم ہے" نیلے کوٹ والے نے اپنا تعارف کروایا "ان دنوں تو میں اِدھر ہوں میرپور خاص میں، کچھ کام ہیں، ویسے کاروبار کے سلسلے میں سب جگہ آنا جانا رہتا ہے"
اسی وقت منصور کو محسوس ہُوا کہ ذیشان نے اُس کے ہاتھ میں چپکے سے کوئی پرچی تھمائی ہے۔ منصور نے پرچی کو مٹھی میں دبا لیا اور انگڑائی لے کر باتھ روم کی طرف چل دیا۔
باتھ روم میں پہنچ کر منصور نے پرچی کھول کر دیکھی۔ اس پر لکھا تھا۔
"ھضوبڈ نا ثوا گ ہوام یا !!"
یہ دراصل ان تینوں کی خفیہ زبان تھی۔ تینوں نے طے کیا تھا کہ خفیہ زبان میں وہ اُردو کے ہر حرف کی جگہ اس سے پہلے والا حرف استعمال کیا کریں گے۔ منصور نے خفیہ پیغام کا اُردو میں "ترجمہ" کیا تو یہ جملہ بنا
"یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے"!
منصور نے ہاتھ دھوئے اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اسے بڑی شدید حیرت ہوئی۔ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ وہیں نشست پر پڑا ہُوا تھا۔
"پتا نہیں انھیں کیا ہُوا، کوٹ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اپنا سوٹ کیس بھی لیتے گئے" ذیشان نے ہنس کر کہا۔۔
منصور نے غور سے اپنے سامان کو دیکھا اور گھبرا کر بولا۔
"ارے غضب ہو گیا۔ وہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس یہیں چھوڑ گیا اور ہمارا سوٹ کیس لے گیا۔
اُسی وقت ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ (دوسری قسط آنکھ مچولی کے ساتھی لکھیں)

# مصوّر چمپینزی

سیّد وجاہت علی

آنکھ مچولی کے صفحات پہ آپ پہلے کبھی چمپینزی کے متعلق یہ تو پڑھ ہی چکے ہیں کہ چمپینزی وہ واحد جانور ہے جو اپنی حرکات و سکنات میں انسان سے قریب تر ہے۔ ہم آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ انسانی حرکات سے قریب تر ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہوگا کہ چمپینزی بھی انسان کی طرح کھا پی لیتا ہوگا۔ اس کا اُٹھنا بیٹھنا انسانوں کی طرح ہوگا یا کچھ اور حرکات بھی۔ مگر ہم نے ایسا تو کبھی نہ سوچا تھا کہ تجریدی آرٹ جیسے موضوع پر بھی چمپینزی کبھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکتا ہوگا۔ لیکن صاحب دیکھیے اس امریکی چمپینزی کو جس نے اپنے مصوّر مالک کو دیکھتے دیکھتے خود بھی آرٹ کا ایسا شہ پارہ تخلیق کر دیا کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔

اس دور میں جب کہ خود انسان بھی پوری طرح تجریدی آرٹ کو نہیں سمجھ پایا۔ بلکہ اکثر کو بنانے والے کے علاوہ کوئی اور مشکل ہی سے اُس کا مفہوم اخذ کرتا ہے۔ ایسے میں چمپینزی کا بنایا ہوا یہ شاہکار یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چمپینزی کے ذریعہ یہ تصویر بنوا کر کاہل نکھٹو اور جاہل لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ دیکھو تم سے تو یہ بندر ہی بہتر ہے خدانخواستہ کہیں آپ بھی وہ تو نہیں جس سے بندر بہتر ہے؟

# مبارک باد

ادارہ آنکھ مچولی اُن تمام ساتھیوں کو تہہ دِل سے مبارکباد پیش کرتا ہے جن کے نام قرعہ اندازی میں نکلے اور جو قیمتی انعامات کے مستحق ٹھہرے۔ جن ساتھیوں کو ۱۵ ستمبر تک بھی انعامات موصول نہ ہوسکیں۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ اس تاریخ کے بعد ہم سے رابطہ کریں۔

(ادارہ)

# ہم کو بندر نہ کہو ہم کہ مصوّر ٹھہرے

کمال سکھانے والے کا
ہے یا سیکھنے والے کا

ایک امریکی چمپینزی
مصوری کرتے ہوئے

تجریدی آرٹ
کا ایک
خوبصورت
نمونہ
چمپینزی
کا
کمالِ فن

BÖWE
COMET
Dry Cleaning is Our Passion
Long time back, we started our career as professional dry cleaners. To date we remain so, but an element of passion has been added in what we do. This has helped us achieve distinction in our field.
Our commitment to cleanliness is known, all over Pakistan.
Snowhite Dry Cleaners
... the living legend of dry cleaning.
Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
KARACHI – LAHORE – RAWALPINDI
A member of the International Fabricare Institute,
the association of professional drycleaners and launderers
KARACHI
Head Office: Abdullah Haroon Road
Ph: 526539, 511711
Karachi Branches:
Bahadurabad 413695, Clifton 526539,
New Town 411302, Kharadar 204175,
Defence 526539, Burns Road 213336,
Rashid Minhas Road 526539,
Amir Khusro Road 526539,
Garden Road 729668
LAHORE
Liberty Market, Opp Liberty Plaza,
Ph: 874933.
RAWALPINDI
Bank Road, Ph: 67988
ARGUS

SWD-1289

# واپسی

شاھنواز فاروقی

تب قائدِاعظمؒ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے!

"آئیے آئیے قائدِاعظم کے پروپیگنڈا سیکریٹری!"

شاہد نے جو کالج کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا مجھے دُور سے دیکھ کر زوردار آواز میں کہا۔ شاہد جب بحث کے موڈ میں ہوتا تھا تو مجھے میرے اصل نام کے بجائے قائدِاعظم کے پروپیگنڈا سیکریٹری کے نام سے پکارتا تھا۔ گزشتہ تین برسوں سے جب سے اُس کے ساتھ میری دوستی ہوئی تھی اُس کا یہی طریقہ تھا۔ میرا بھی بحث کا مُوڈ ہوتا تھا تو میں بھی اُسے شاہد کے بجائے "دشمنِ قائد" کہا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی زوردار آواز میں جواب دیا۔

لگتا ہے دشمنِ قائد آج پاگل خانے سے سیدھے چلے آرہے ہیں۔ اسی لیے مارے خوشی کے اتنی زوردار آوازیں نکل رہی ہیں۔"

"ہا...ہا...ہا" شاہد نے میرا جواب سُن کر قہقہہ لگایا اور لپک کر مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔

کہتے ہیں مختلف مزاج اور خیالات رکھنے والے لوگ کبھی کبھی ایک دوسرے کے بہت اچھے

دوست ہو جاتے ہیں۔ معلوم نہیں اس بات میں کتنی سچائی ہے۔ لیکن کم از کم میرے اور شاہد کے معاملے میں یہ بات بالکل درست ہے۔ ہر طرح کی کتابوں کے مطالعے اور ہر موضوع پر بحث کرنے کی عادت کے علاوہ شاہد اور مجھ میں کوئی بات مشترک نہ تھی۔ شاہد کے اور میرے گھریلو ماحول میں بھی بڑا فرق تھا... شاہد کا گھرانہ آزاد خیال اور کچھ کچھ کمیونسٹ سا تھا۔ اور میرا خاصا مذہبی۔

شاہد سے میری دوستی اُس وقت شروع ہوئی جب میں درجہ نہم کا طالب علم تھا۔ شاہد کسی دوسرے اسکول کو چھوڑ کر میری کلاس میں داخل ہوا تھا۔ اس سے میرا تعارف ایک افسوسناک واقعے کی وجہ سے ہُوا۔ ایک دن اُس نے مطالعۂ پاکستان کے پیریڈ میں میری پسندیدہ ترین شخصیت قائداعظمؒ پر طنزیہ جُملے اُچھالے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شاہد کے جُملے سُن کر مطالعۂ پاکستان کے اُستاد کا رنگ صدمے سے فق ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے شاہد کو خاصا ڈانٹا تھا۔ مگر اُن کی ڈانٹ ڈپٹ شاہد کو قائل نہیں کر سکی تھی۔

شاہد آدھے گھنٹے میں میری دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا۔ اُس کے خیالات کتنے ہی تکلیف دہ سہی لیکن میرا خیال تھا کہ بحث مباحثے کے ذریعے میں اُسے قائل کر لوں گا۔ پیریڈ ختم ہوا تو میں شاہد کے پاس گیا اور اُس سے دوستی کی خواہش ظاہر کی۔ شاہد نے جو میری طرح کلاس میں اکیلا اکیلا رہتا تھا۔ میری درخواست قبول کر لی۔

اگلے روز میں شاہد کے گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کے ڈرائینگ روم میں جدید کمیونزم کے بانی کارل مارکس اور لینن کی تصویریں آویزاں ہیں۔ خود شاہد کے کمرے میں بھی کارل مارکس کی ایک تصویر لگی تھی۔ یہ تصاویر دیکھ کر میں کچھ کچھ سمجھ گیا کہ شاہد قائدِاعظمؒ کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔

"کیا تم کمیونسٹ ہو؟" میں نے شاہد کے کمرے میں اُس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں میں مسلمان ہوں۔" شاہد نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے اپنے کمرے میں یہ تصویر کیوں لگا رکھی ہے۔" میں نے پوچھا

"اس لیے کہ یہ ایک ایسا انسان ہے جس نے اپنی فکر سے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد پر آمادہ کیا!" شاہد کا جواب تھا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں قائدِاعظمؒ کو بھی ماننا چاہیے۔ کیونکہ اُنھوں نے بھی برِصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے مثالی ظلم اور ناانصافی سے نجات دلانے کے لیے پاکستان بنایا۔"

"مگر پاکستان قائدِاعظم نے تو نہیں بنایا۔" شاہد نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کس نے بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"عوام نے۔" شاہد کا جواب تھا۔
"مگر قائدِ اعظم کی بصیرت افروز قیادت کے بغیر عوام پاکستان نہیں بنا سکتے تھے۔ بھلا چرواہے کے بغیر بھی کبھی بھیڑ بکریاں گھر لوٹی ہیں؟"
"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ قائدِ اعظم کے بغیر پاکستان نہیں بن سکتا تھا؟" شاہد نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔
"ارے بھئی میں کیا اب تو دشمن بھی یہی کہتے ہیں۔ کیا تم نے قیامِ پاکستان کے وقت برِصغیر کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اُس خط کے بارے میں پڑھا یا سُنا نہیں جو اُس نے قائدِ اعظم کی وفات کے بعد لکھا تھا۔ اور جس میں اُس نے کہا ہے کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ قائدِ اعظم ۱۹۴۸ء میں انتقال کر جائیں گے تو میں تقسیمِ برِصغیر کے منصوبے کو ایک سال کے لیے ملتوی کر دیتا۔ گویا قائدِ اعظم کے بغیر پاکستان نہ بنتا۔" میں نے جوش میں آکر ایک تقریر کر ڈالی۔
"مگر..." شاہد نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میں اُسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر پھر شروع ہو گیا۔
"اور کیا تم نے حال ہی میں ہندوستان سے شائع ہونے والی اُس کتاب کے بارے میں بھی نہیں پڑھا جو ایک ہندو نے لکھی ہے اور جس نے اُس کتاب میں کہا ہے کہ پاکستان مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندوؤں اور کانگریس کے متعصب لیڈروں نے بنوایا ہے۔ جنہوں نے اپنی قیادت پکی کرنے کے لیے قائدِ اعظم کو کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ اس مصنف کے بقول نہ قائدِ اعظم کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوتے نہ پاکستان بنتا۔"
شاہد میرے تابڑ توڑ مدلل حملوں سے بوکھلا گیا تھا اور اُسے کوئی جواب نہیں سُوجھ رہا تھا۔ غالباً اُس کے بزرگوں نے اُسے اِن دلیلوں کا کوئی جواب فراہم نہیں کیا تھا۔
شاہد سے اکثر قائدِ اعظم کی عظمت پر بحث ہوتی۔ شاہد ہر بار ہار جاتا مگر قائدِ اعظم کی عظمت کو تسلیم نہ کرتا۔ میں اس پر کبھی کبھی اُسے ابو جہل کہہ دیتا تو وہ اور چڑ جاتا۔ مجھے کسی کو بحث میں ہرا کر کبھی خوشی نہیں ہوتی تھی مگر اس بحث میں شاہد کو ہرا کر مجھے عجیب طرح کی خوشی ہوتی۔ چنانچہ میں تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظم سے متعلق کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرتا اور اُن سے دلائل جمع کر کے شاہد پر حملہ آور ہوتا۔ شاہد جب بحث میں ہارنے لگتا تو بلند آواز میں بول کر مجھے چُپ کرانے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی

ہم دونوں بہت جوش میں آجاتے اور لگتا کہ اب عوامی اصطلاح میں جُوتا چل جائے گا۔ مگر شاید ہم واقعی "جمہوریت پسند" لوگ تھے۔ اس لیے ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔

جب لمبی چوڑی بحثیں کرنے کے بعد میں گھر جاتا تو بہت دیر تک میرا ذہن اُلجھا رہتا۔ میں سوچتا کہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ ہمارے مُلک میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو رہتے یہاں ہیں، کھاتے یہاں کا ہیں، جن کا جینا مرنا اِسی دھرتی اِسی مُلک میں ہے لیکن جو اپنے ہی ملک اور اپنے ہی قومی رہنماؤں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ آخر کیوں؟

میرا دل چاہتا کہ میں پاکستان کی گلی گلی میں جاکر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ جو قومیں اپنے ہیروز کی قدر نہیں کرتیں۔ تاریخ بھی اُن قوموں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتی ہے اور اُن قوموں کو بھُلا دیتی ہے۔

میٹرک کرنے کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ اس لیے ہماری دوستی برقرار رہی اور بحث کا سلسلہ بھی، ہم دونوں کی رہائش بھی، چونکہ کراچی کے ایک ہی علاقے یعنی نارتھ ناظم آباد میں تھی۔ اس لیے ہم دونوں ایک ساتھ کالج جاتے آتے تھے۔ K_2 کی بس کے ذریعے۔

نارتھ ناظم آباد کے علاقوں میں رہنے والے لوگ K_2 کی بسوں کو مَرتے دَم تک نہیں بھُول سکتے۔ کراچی میں یُوں تو اکثر بسوں کے کنڈیکٹر ڈرائیور مسافروں سے توہین آمیز سلوک کرتے ہیں۔ مگر روٹ نمبر K_2 کی بسوں کے اکثر کنڈیکٹر اور ڈرائیور صاحبان اپنے مسافروں کے ساتھ انتہائی بدتمیزی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مثلاً یہ حضرات اکثر یہ کرتے تھے کہ اپنے آخری اسٹاپ سے بہت پہلے مسافروں کو بس سے اُتار دیتے اور پیچھے سے آنے والی دوسری بس میں سوار کرا دیتے تھے۔ اور خود خالی بس لے کر آخری اسٹاپ پر پہنچ جاتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس روٹ کی تمام بسوں کے ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں میں اس اَدل بَدل میں مثالی تعاون پایا جاتا تھا۔ اُن حضرات کا یہ عمل برسوں سے جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔

اُس شام بھی یہی ہُوا۔ شاہد اور میں صدر سے کتابیں خرید کر گھر آنے کے لیے K_2 کی ایک بس میں سوار ہوئے۔ ڈرائیور نے حسبِ عادت آخری اسٹاپ سے بہت پہلے بس کھڑی کر دی اور مسافروں سے کہا کہ اُتر کر پیچھے آنے والی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ سُنتے ہی مسافر عادتاً اُترنے لگے۔ شاہد اور میں بھی اُترنے ہی والے تھے کہ یکا یک پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک دُبلے پتلے سے بزرگ جن کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ کھڑے ہوگئے۔ اور انھوں نے زوردار انداز میں تقریر کرنی شروع کر دی۔

"بس سے کوئی نہیں اُترے گا... سب لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں۔ اِن کے تو فرشتے بھی آپ کو آخری اسٹاپ تک لے کر جائیں گے۔ اِنھوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟"

بزرگ کی جوشیلی تقریر سُن کر وہ مسافر جو اُترنے کے لیے اپنی سیٹوں پر سے اُٹھ گئے تھے دوبارہ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ جو مسافر نیچے اُتر گئے تھے وہ بھی دوبارہ آکر بس میں بیٹھ گئے۔ بس کا کنڈیکٹر اور ڈرائیور اس صورتِ حال کو پریشانی کے عالم میں دیکھتے رہے۔ وہ حیران وششدر تھے۔

شاید یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اُن کو للکارا تھا۔ عام حالات ہوتے تو کنڈیکٹر بڑے میاں کی گردن میں ہاتھ دے کر بس سے نیچے دھکیل دیتا، لیکن آج سارے مسافر بڑے میاں کی قیادت میں ایک ہو چکے تھے۔ وہ سب کے سب واپس آکر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟

یہ دیکھ کر کنڈیکٹر نے پینترا بدلا اور مسافروں سے بس سے اُتر جانے کی خوشامدیں کرنے لگا۔ لیکن کسی پر بھی اثر نہ ہوا۔ بلکہ دو تین نوجوان تو کنڈیکٹر کو مارنے پر تُل گئے۔ دس منٹ کی جھک جھک کے بعد بالآخر ڈرائیور کو گاڑی چلانی پڑی۔ چند اسٹاپ گزرنے کے بعد وہ بزرگ اپنی منزل پر اُتر گئے۔ کنڈیکٹر نے جیسے ہی دیکھا کہ بڑے میاں اُتر چکے ہیں۔ اُس نے سب مسافروں کو خونخوار لہجے میں حکم دیا کہ وہ فوراً بس خالی کر دیں۔ حیرت انگیز طور پر سب لوگ کان دَبا کر اُتر گئے۔ یہاں تک کہ وہ نوجوان بھی جو تھوڑی دیر پہلے کنڈیکٹر کو مارنے پر آمادہ تھے۔

"کچھ سمجھے یہ سب کیا تھا؟" میں نے بس سے نیچے اُتر کر شاہد سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" شاہد نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے خیال میں بڑے میاں کی موجودگی میں کوئی بس سے کیوں نہیں اُترا۔ اور اُن کے جاتے ہی سب کیوں اُتر گئے؟"

شاہد نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سر کو ہلایا تو میں نے کہا۔

"یہ ہوتی ہے قیادت... یہ جو بزرگ تھے تم اُنھیں قائدِ اعظم سمجھ سکتے ہو۔ اور بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مسلمان قوم۔ جس طرح یہ بزرگ نہ ہوتے تو بس کا کنڈیکٹر ہم سب کو بہت پہلے بس سے اُتار چکا ہوتا۔ اسی طرح قائدِ اعظم نہ ہوتے تو انگریز اور ہندو مل کر مسلمانوں کو بھی تاریخ کے صفحات میں بہت پیچھے دھکیل چکے ہوتے۔"

شاہد میری باتیں بڑے غور سے سُنتا رہا۔ یکایک اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا اور اپنا سر جُھکا لیا۔

اس واقعے کے بعد شاہد دو تین روز تک چُپ چُپ رہا۔ اِن دنوں میں ہماری قائدِ اعظمؒ پر ایک بار بھی بات نہ ہوئی۔

ایک دن میں شاہد سے ملنے کے لیے اُس کے گھر گیا۔ وہ مجھے لے کر جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا، میری نظر سامنے کی دیوار پر پڑی تو حیرت سے میرا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ دیوار پر بڑے سے فریم میں قائدِ اعظم کی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے شاہد کی طرف دیکھا تو وہ ہولے سے مُسکرایا۔ چند لمحے یُوں ہی گزر گئے۔ پھر شاہد نے آگے بڑھ کر قائدِ اعظمؒ کی تصویر کو دیوار پر سے اُتار لیا۔ اور اُسے عقیدت سے دیکھنے لگا۔

اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہہ کر قائدِ اعظمؒ کی تصویر پر آنکھ کے قریب جا گرے۔ شاہد نے لمحہ بھر بعد تصویر کو بلند کیا تو آنسوؤں کے وہ قطرے قائدِ اعظمؒ کی آنکھ سے بہتے ہوئے تصویر کی شیروانی کے آخری بٹن تک آ گئے۔

" دیکھو قائدِ اعظمؒ رو رہے ہیں۔" میں نے خوشی سے بھرے ہوئے لہجے میں شاہد سے کہا۔

" ہاں! اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی گھر واپسی پر۔"

شاہد نے یہ کہا اور مجھ سے لپٹ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ قائدِ اعظمؒ کی تصویر دو بیٹوں کے سینوں کے درمیان آ کر ہر طرف سے محفوظ ہو گئی تھی۔

## آنکھ مچولی ایک سال تک مُفت حاصل کیجیے

اک ذرا سی زحمت سے آنکھ مچولی کے دو سالانہ خریدار بنائیے اور خود سال بھر تک ہر ماہ آنکھ مچولی مفت حاصل کیجیے۔ آنکھ مچولی رسالۂ ادب بھی ہے اور جریدۂ علم بھی۔ اس کی خوبیاں اپنے دوستوں سے بیان کیجیے اور انہیں آنکھ مچولی کے حلقۂ دوستی میں شامل کیجیے۔ یہ علم دوستی بھی ہوگی اور ایک بڑا علمی فائدہ بھی۔

طریقۂ کار جاننے کے لیے خصوصی بچت سکیم کا صفحہ دیکھیے

# نینا اور بگ مین

ایک سابق امریکی صدر اور
ایک بچّی کی دلچسپ ملاقات

---

سیّد خورشید عالم

---

میں غالباً نو برس کی ہوں گی جب میں
چھٹیاں گزارنے اپنی امی کے ہمراہ نانی جان
کے ہاں جایا کرتی تھی۔
ہماری نانی میساچوسیٹس میں رہتی تھیں
۔ نانی کے گھر کے ایک طرف
مسٹر رچرڈ واسٹن رہتے

تھے۔ ان کے بچّے بے انتہا شرارتی تھے۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر بنے ہوئے ایک بڑے خوب صورت مکان میں ایک شخص رہتا تھا۔ جسے میں نے "بگ مین" کا نام دیا ہُوا تھا۔ اس شخص کا اصل نام گروور کلیولینڈ تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ یہ شخص سابق امریکی صدر ہے۔ اور دوبارہ انتخاب میں حصّہ لینے والا ہے۔ یہ دراز قد اور بھاری بھرکم سا آدمی تھا۔ مجھے اس کی موٹی موٹی مونچھیں اچھّی لگتی تھیں۔

مجھے ان دنوں ڈرم بجانے کا بڑا شوق تھا۔ مگر وہاں اس شوق کا پورا ہونا مشکل تھا۔ ایک رات امّی نے کہا کہ اگلی شام ایک اسکول میں مجھے ڈرم بجانے کی ریہرسل کرنے جانا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس پر امّی نے مجھے غصّے میں یہ کہہ کر میرے کمرے میں بھیج دیا کہ "بہت ہوچکی شرارت" مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔ چنانچہ مارے خوشی اور گھبراہٹ کے مجھے ٹھیک طرح نیند بھی نہیں آئی۔ صبح سویرے میں نے ایک بڑے رومال میں کھانے کی کچھ چیزیں رکھیں اور گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر آگئی۔ ابھی میں تھوڑی ہی دُور گئی ہوں گی کہ مجھے گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دی۔ میں ایک طرف ہٹ گئی اور پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ "ارے یہ تو بگ مین ہے"۔ میں نے سوچا۔ وہ اپنی چھوٹی سی گھوڑا گاڑی پر میرے قریب آکر رُک گیا۔ گھوڑا گاڑی پر مچھلی پکڑنے کا سامان رکھا ہُوا تھا۔

"نینا! اتنی صبح سویرے کہاں کی سیر ہو رہی ہے بھئی؟" اُس نے میرے گھریلو نام سے انتہائی خوشگوار انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ایک لمحے کو تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ "بگ مین" کو کیا جواب دُوں چنانچہ چند لمحے سوچ کر میں نے بڑی لاپروائی کے انداز میں کہا۔

"میں فلاڈیلفیا جا رہی ہوں"۔

"بھئی فلاڈیلفیا تو بہت دُور ہے۔ اگر تم کہو تو میں تم کو کچھ دُور تک چھوڑ آؤں؟" اس نے مجھ سے مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔ میں نے فوراً سر ہلایا۔ اور گھوڑا گاڑی پر چڑھ کر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ اس نے گھوڑے کی پُشت تھپتھپائی اور ہمارا سفر شروع ہوگیا۔

"کیا تمہاری امّی کو پتا ہے کہ تم فلاڈیلفیا جا رہی ہو؟" اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرا دل بھر آیا اور میں نے "بگ مین" کو سب کچھ بتا دیا کہ میں گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

"نینا! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم گھر چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو؟" میں نے "بگ مین" کو بتایا کہ اس کا بڑا سبب میرا موسیقی اور خصوصاً ڈرم بجانے کا شوق ہے۔ مگر میں مسٹر رچرڈ کے شریر بچّوں کے ساتھ ڈرم بجانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔

"پہلی مرتبہ جب مجھے ایک بڑے مجمع سے خطاب کرنا پڑا تو میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، اور مجھے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے مگر میں نے اپنا اعتماد بحال رکھا اور اس طرح تقریر کی جیسے میں ان سب لوگوں سے فرداً فرداً واقف ہوں۔ اگر تم بھی اسی طرح فلاڈیلفیا چلی گئیں تو مسٹر رچرڈ کے بچوّں کو کس طرح معلوم ہوگا کہ تم بہت اچھا ڈرم بجاتی ہو۔" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مجھے "بگ مین" کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا۔

" میں مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلو اور خود بھی مچھلیاں پکڑو۔ یہ بڑا اچھا مشغلہ بھی ہے۔ اور اس طرح تمہیں سوچنے کا کچھ اور موقع بھی مل جائے گا۔ کیوں نینا ٹھیک ہے نا؟" اُس نے کہا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم جھیل پر پہنچ گئے۔ "بگ مین" کی ایک خوبصورت موٹر بوٹ جھیل کے کنارے موجود تھی۔ میں جلدی سے موٹر بوٹ میں بیٹھ گئی۔ "بگ مین" نے مجھے مچھلی پکڑنے کی ایک راڈ تھمائی اور مجھ سے مچھلی پکڑنے کے اصول بیان کرنے لگا۔

" مچھلی پکڑنے کا ایک اصول ہمیشہ یاد رکھو اور وہ یہ کہ اپنے اندر ضبط کی عادت ڈالو۔ مچھلی فوراً بھی پھنس سکتی ہے اور کئی گھنٹے بعد بھی۔ لہٰذا خاموشی سے مچھلی پھنسنے کا انتظار کرو۔" "بگ مین" بھی ایک فشنگ راڈ پانی میں ڈال کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ہم بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد "بگ مین" نے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ اور اُنہیں ایک ٹوکری میں رکھنے لگا۔ میں اُس کی مہارت دیکھ کر بہت حیران تھی۔

تھوڑی دیر بعد میرے کانٹے میں بھی ایک بڑی مچھلی پھنس چکی تھی۔ میں خوشی اور حیرانی سے چیخیں مارنے لگی۔ "بگ مین" نے ہنستے ہوئے مچھلی کو کانٹے سے نکالنے اور ٹوکری میں رکھنے میں میری مدد کی۔ دوپہر میں ہم نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم کافی دیر تک سیر کرتے رہے۔ شام کو واپس آتے ہوئے اس نے پوچھا "کیا اب بھی تم فلاڈیلفیا جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

میں نے "بگ مین" کو غور سے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

" میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ بلکہ جب تک میری چھٹیاں ہیں میں یہیں رہوں گی اور آپ کے ساتھ خوب سیر کیا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بگ مین" میری بات پر ہنس پڑا۔ اب مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ گھر واپس جا کر امّی سے شدید ڈانٹ کھانی پڑے گی اور عجب نہیں کہ امّی ایک آدھ ہاتھ بھی جڑ دیں۔ میں نے اپنا خوف جب "بگ مین" پر ظاہر کیا تو وہ مُسکرایا اور میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"نینا تم فکر نہ کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ تمہاری امّی تمہیں کچھ نہیں کہیں گی"۔ اور واقعی ہُوا بھی یہی کہ جیسے ہی "بگ مین" نے گھوڑا گاڑی میری نانی جان کے گھر کے آگے روکی، امّی تیزی سے باہر آئیں، اور انہوں نے مجھے لپٹا لیا۔ پھر انہوں نے اور نانی جان نے بڑے احترام سے "بگ مین" کو اندر بلایا۔ میں نے دیکھا کہ گھر کا ہر فرد "بگ مین" کے آگے بچھا جا رہا ہے۔ نانی جان نے اُسے کافی پیش کی۔ امّی نے اس سے پوچھا...

"مسٹر کلیولینڈ، نینا نے آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کیا نا؟"

"جی نہیں... نینا بہت ہی اچھی بچّی ہے۔ ایسے بچّے کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ بس انہیں مکمل توجّہ کی ضرورت ہوتی ہے"۔ "بگ مین" نے کہا۔ پھر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سب کو خدا حافظ کہنے کے بعد... "بگ مین" میرا مطلب ہے مسٹر کلیولینڈ میری طرف آئے۔ انہوں نے جُھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور بولے۔

"نینا بیٹے۔ تمہیں سیر کے لیے کہیں بھی جانا ہو میرے پاس آجانا۔ ٹھیک ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں اچانک بول پڑی۔

"دوبارہ امریکہ کا صدر بن کر آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے نا؟" میری اس بات پر انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولے۔

"میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں بھُول سکتا اور پھر میں تو تمہارا "بگ مین" ہوں۔ میں تمہیں کیسے بھُول سکتا ہوں؟" میں جھینپ گئی۔ اور مسٹر کلیولینڈ ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔


## جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا، مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبّت کیجیے اس کا خیال رکھیے

ادارہ آنکھ مچولی

صالح ارشاد

# کامیابی کے سات اصول

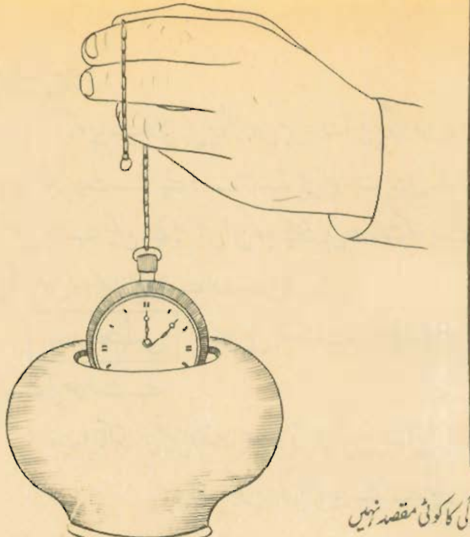

براہِ کرم اس مضمون کو وہ لوگ نہ پڑھیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں

**وقت** ایک ایسی قیمتی دولت ہے جو ہر شخص کو میسر ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ لوگ اس دولت کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں اور کچھ غلط طریقے سے۔ جو لوگ اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں وہ کامیاب انسان کہلاتے ہیں۔ اور جو بے وقوف اسے بے دریغ ضائع کرتے ہیں وہ بیٹھ کر پھر دل روتے ہیں۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں انہوں نے وقت کا ایک ایک لمحہ بامقصد گزارا ہے جس کے نتیجے میں انھوں نے وہ نام پایا جو آج بھی زندہ ہے۔

زیادہ تر لوگ اپنا بیشتر وقت فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ بغیر اس بات کا خیال کیے کہ یہ کتنی قیمتی چیز ہے۔ اگر ہم ذرا سا سمجھ داری کا ثبوت دیں تو بہت سا قیمتی وقت فضول کاموں میں صرف کرنے کے بجائے بامقصد کاموں میں استعمال کر کے بے شمار فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے آپ کو اپنی طرزِ زندگی کا احتساب کرنا ہوگا یعنی آپ کو بہت سی ایسی بُری عادتوں کو چھوڑ دینا ہوگا جو وقت کے زیاں کا باعث ہیں اور ایسے اصولوں کو اپنانا ہوگا جو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ دراصل ہماری زندگی میں شامل بہت سی بُری عادتیں ہی وقت توانائی اور پیسہ کی بربادی کی وجہ ہیں جن کو ہم برسوں اپنائے رہتے ہیں۔ یہاں چند ایسی عادتیں بیان کی جا رہی ہیں جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے پیچھا چھڑا کر ہم اپنا کافی قیمتی وقت بچا سکتے ہیں۔

**ٹی وی** ہمارے گھروں اور ہماری زندگی میں اب ٹی وی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ ٹی وی جس کو ہم تفریح اور سکون کا ذریعہ سمجھتے ہیں، چپکے چپکے ہمارا کتنا قیمتی وقت لوٹ رہا ہے ہمیں معلوم

ہی نہیں ہوتا۔

آپ کو چاہیے کہ ٹی وی پروگراموں میں صرف اُن پروگراموں کا انتخاب کریں جو آپ کے ذوق اور عمر کے مطابق ہیں۔ مثلاً بہت سے ایسے ڈرامے ہوتے ہیں جو صرف بڑوں کے لیے ہوتے ہیں اور جن کو سمجھنا بچّوں کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن بچے پھر بھی اُن کو دیکھتے ہیں اور رات کو دیر سے سوتے ہیں، فضول اور سمجھ میں نہ آنے والے پروگراموں کو دیکھنا چھوڑیے اور وقت کی قدر کیجیے۔

**بد نظمی** گھروں میں ہتھوڑے اور اسپٹلر کی تلاش بے وقوفی اور وقت کو بے دردی سے ضائع کرنے کی علامت ہے۔

آپ اپنا کتنا ہی قیمتی وقت چیزوں کی تلاش میں ضائع کرتے ہیں کچھ اندازہ ہے آپ کو اس بات کا

"ہر چیز جگہ پر اور ہر چیز کے لیے جگہ"

کی کہاوت صدیوں پُرانی سہی لیکن آج بھی قابلِ عمل ہے۔ آپ کا مکان چاہے دس کمروں کا ہو یا دو کمروں کا، چیزوں کو اُن کی مقررہ جگہ پر رکھیں تاکہ ان کی تلاش میں وقت ضائع نہ ہو۔ زندگی میں نظم اور سلیقہ نہ صرف وقت کو بچاتا ہے بلکہ ایک کامیاب انسان بننے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے

**دیکھ بھال** گھریلو استعمال کی اشیاء کی دیکھ بھال میں خرچ کیا جانے والا تھوڑا وقت بہت سا قیمتی وقت اور پیسہ بچاتا ہے ایک رِستے ہوئے نل کو ٹھیک کر دینا سال دو سال بعد سیل جانے والی دیوار کو دوبارہ بنانے سے زیادہ بہتر ہے۔ صحت کی مناسب دیکھ بھال سے نہ صرف تندرست رہا جا سکتا ہے بلکہ اسپتالوں کے چکّر میں ضائع ہونے والے وقت کو بھی بچایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر معمولی سی توجّہ دے کر بہت سا وقت بچا سکتے ہیں۔

**انتظار** ہم بہت سا وقت انتظار کی کوفت میں مُبتلا ہو کر گزار دیتے ہیں، کبھی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے ایک گھنٹہ تک لائن میں لگے رہتے ہیں اور کبھی کسی سے ملنے کے لیے گھنٹوں اُن پُرانے رسالوں کے مطالعے میں گزار دیتے ہیں جو پہلے سے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔

آپ جب بھی ڈاکٹر کو دکھانے جائیں یا کسی سے ملنے جائیں تو اپنے ہمراہ ایک اچھی کتاب ضرور لے جائیں جس کو انتظار کے دوران پڑھ کر نہ صرف آپ انتظار کی کوفت دُور کر سکتے ہیں بلکہ فضول ضائع ہونے والے وقت کو بھی بہتر طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ اپنے دوست کو بھی خط لکھ سکتے ہیں جو آپ سے اس بناء پر ناراض ہو کہ آپ خط نہیں لکھتے ہیں۔ اس طرح آپ فضول ضائع ہونے والے وقت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

**ناقص منصوبہ بندی** کسی کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لیے صحیح منصوبہ بندی نہایت ضروری ہے۔ آپ کو کیا پڑھنا چاہیے اور کتنا پڑھنا چاہیے۔ اس بات کا فیصلہ نہایت ضروری ہے۔

ہمارے بہت سے ساتھیوں کو یہی معلوم نہیں ہوتا کہ اُن کا ذہنی رجحان کس طرف ہے اور اس کے برخلاف وہ پڑھے جاتے ہیں اور آگے چل کر عملی میدان میں پریشان ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی زندگی میں بہت سے ایسے کام ہوتے ہیں جن کو اگر صحیح طور پر انجام دیا جائے تو نہ صرف بہت سا وقت بچایا جا سکتا ہے بلکہ پریشانیوں اور تکلیفوں سے بھی نجات ہو سکتی ہے مثلاً بجلی اور گیس کا بل اگر فوراً جمع کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ آخری تاریخ کو لمبی لائن میں قیمتی وقت کو ضائع کر کے جمع کیا جائے۔

**خوش اخلاقی** خوش اخلاق ہونا بہت اچھی عادت ہے لیکن حد سے زیادہ مروت اور اخلاق بھی نقصان دہ ہو جاتا ہے جس طرح ضرورت سے زیادہ میٹھا اچھا نہیں ہوتا۔

اکثر آپ ایسی محفلوں میں شروع سے آخر تک شریک رہتے ہیں جس میں آپ کے لیے بیٹھنا ناقابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن آپ اخلاقاً محفل سے نہیں اُٹھ پاتے جبکہ اُس وقت آپ کو بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔ ایسے موقعوں پر آپ صرف یہ کہہ کر "معاف کیجیے گا مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔"

نہ صرف دوستوں کے درمیان سے اُٹھ سکتے ہیں بلکہ بے دلی اور بے دھیانی سے سُنی جانے والی بے سروپا گفتگو سے بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنا بہت سا قیمتی وقت بچا سکتے ہیں۔ کبھی کبھی خوش گپّیوں میں وقت گزار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس بات کو عادت نہ بنائیے۔ یاد رکھیے کہ ایسی بے کار باتیں کرنے والے دراصل عمل کی دُنیا سے دُور رہتے ہیں۔ وہ خود تو کچھ کرتے نہیں ہیں۔ تنقید اور خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ اس لیے بے کار باتوں میں شریک ہونے کے بجائے وقت کو مفید کاموں میں استعمال کیجیے۔

**دعوتیں** ہم اپنا بہت سا وقت دوسروں کے ایسے کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں جن کو انجام دینے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا۔ یعنی دوسروں کے کئی ایسے کام اور بہت سی ایسی دعوتیں جن میں جانے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔ اُن کو قبول کر لیتے ہیں جن میں شرکت کرنا اتنا اہم نہیں ہوتا اور نتیجتاً بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں۔

کسی بات سے انکار کرنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "میں اس بارے میں سوچوں گا یا کوشش کروں گا آنے کی"۔ اس طرح آپ کا دوست بھی ناراض نہیں ہوگا اور آپ بھی بہت سے ایسے کاموں سے بچ جائیں گے جنھیں آپ کرنا نہیں چاہتے۔

# ذہانت کسی کی میراث نہیں

## ذہانت آزمانے کے دلچسپ کھیل

یہ چاروں تصویریں بے ترتیب ہیں۔ انہیں ترتیب دے دیں تو ایک مکمل کہانی بن جاتی ہے کہانی سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے ترتیب درست کرلیجیے۔

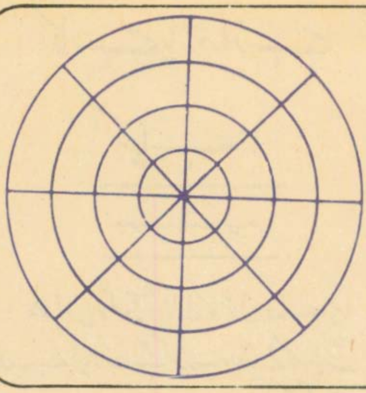

کیا آپ اس دیئے ہوئے خاکے میں آٹھ
نقطے اس انداز سے لگا سکتے ہیں کہ ہر
سیدھے خط پر بھی دو نقطے آجائیں اور ہر
دائرے میں بھی دو نقطے آجائیں۔

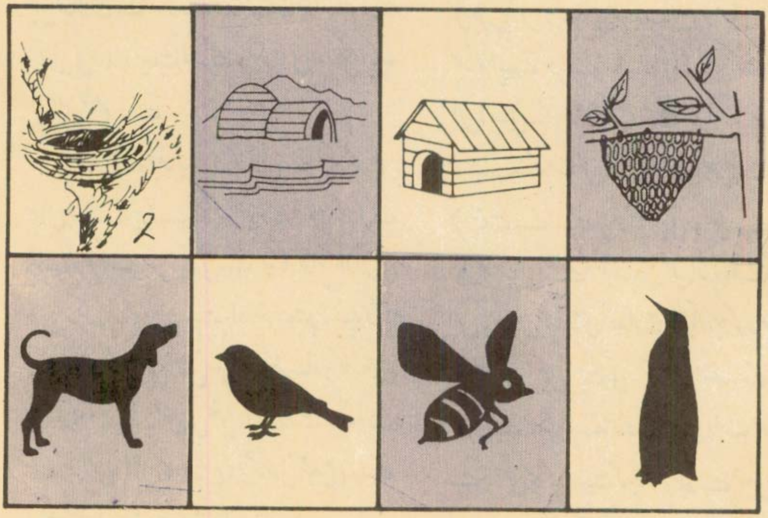

چار مکان ہیں چار مکین۔ کون سا مکان کس کا ہے؟ ذرا سوچ کر بتائیے۔

# کار ہے یا جہاز ہے کیا ہے؟؟

جنید شمیم

ہر آدمی کو گھوڑے دوڑانے کا شوق ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے خیالات کے گھوڑے دوڑانے کا۔ البتہ آدمی، آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی خیالات کے گھوڑے دوڑاکر کارنامہ انجام دیتا ہے اور کوئی بیچارہ خیالات کے گھوڑوں کی دولتیاں کھاکر ادھ مُوا ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں خیالات کے گھوڑے دوڑاکر کارنامہ انجام دینے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ٹیلر نامی امریکی ایک ایسا ہی شخص ہے۔

ٹیلر کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ایک کار میں ہوائی جہاز کے پُرزے لگاکر "ایرو کار" نام کی ایک عجیب وغریب چیز تیار کی ہے۔ یہ کار عام کاروں کی طرح سڑک پر بھی چلتی ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر ہوائی جہاز کی طرح فضا میں بھی اُڑتی ہے۔ ٹیلر نے یہ کار پہلی بار ۱۹۵۰ء میں ڈیزائن کی تھی۔ اُس وقت سے اب تک ٹیلر اس "اُڑن کار" میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کرکے اسے مسلسل بہتر سے بہتر بناتا رہا ہے۔

ٹیلر جب کار کو اُڑانا چاہتا ہے تو کار کے ساتھ جُڑے ہوئے ہوائی جہاز کے پُرزوں کو کھول دیتا ہے اور جب وہ اُسے عام کار کی طرح زمین پر چلانا چاہتا ہے تو جہاز کے پُرزوں کو کار کے دائیں بائیں لگے ہوئے کُنڈوں میں فٹ کردیتا ہے۔ عام طور پر اس کام میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت صرف ہوتا ہے۔ کار کو فضا میں بلند کرنے کے لیے ٹیلر اُسے پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑاتا ہے اور پھر یکایک کار کے اسٹیرنگ وہیل کو پیچھے کی جانب کھینچ لیتا ہے اور کار فضا میں ہوائی جہاز کی طرح اُڑ جاتی ہے۔ یہ کار فضا میں ۲۱۷ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرسکتی ہے۔

اس کار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اُسے اُڑنے یا زمین پر اُترنے کے لیے ہوائی جہاز کی طرح رن وے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اس کار کو اپنے گھر کے سامنے کی ذراسی کشادہ گلی میں آسانی کے ساتھ اُتار سکتے ہیں۔ یہ کار مختلف نوعیت کے مسائل کے باعث ابھی تک عام فروخت کے لیے تیار نہیں کی جاسکی ہے۔ تاہم ٹیلر کا خیال ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب اس کی اُڑن کار بڑی تعداد میں تیار ہوکر عام افراد کے استعمال میں آسکے گی۔ ٹیلر اس مقصد کے لیے کار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے دن رات سوچتا رہتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا تو کسی اور سے ہوگا۔ آیئے ہمارے ساتھ مل کر آپ بھی خیالات کے گھوڑے دوڑایئے۔ کیا کہا؟ آپ کے پاس خیالات کے گھوڑے نہیں ہیں؟ تو پھر ہمیں یہ ہنہنانے کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟؟

# کار میں جُڑ گیا
# جہاز میاں

اُڑن کار کا یہ منظر دیکھیں
کب ہوتا ہے عام

پیچھے سے میں جہاز ہوں
آگے سے کار ہوں

چلتی ہے مجھ سے کار بھی
یارو جہاز بھی

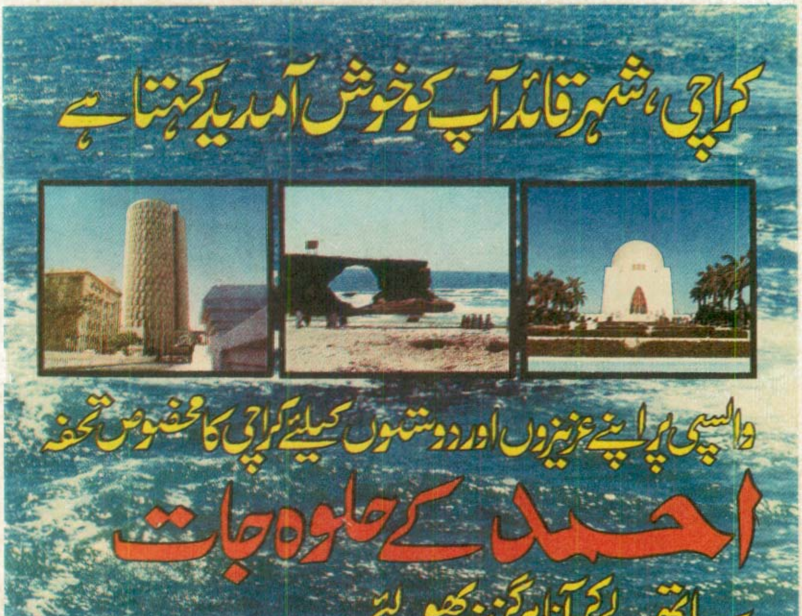
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

ڈاکٹر
جمیل
جالبی

# مچھیرے کی کہانی

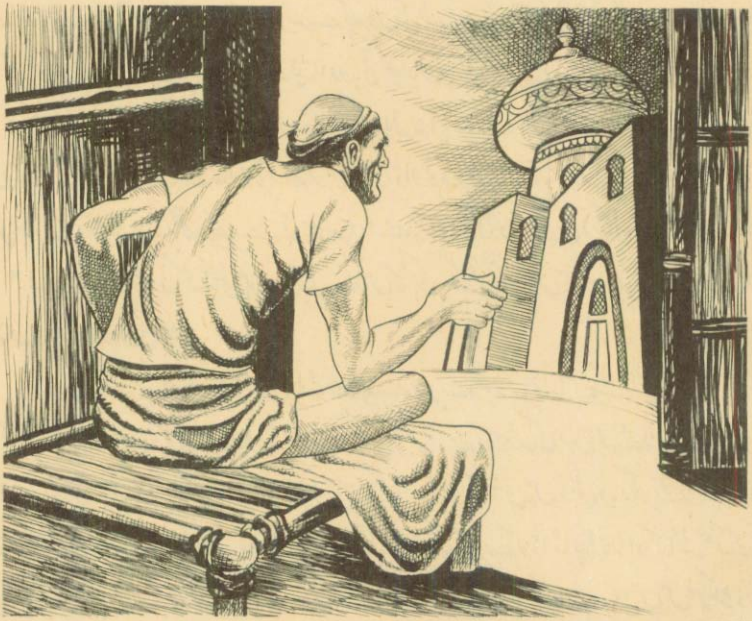

## لالچ نے مچھیرے کی بیوی کو اندھا کر دیا تھا

یہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اس جگہ پر جہاں آج منگھو پیر کا مزار ہے، ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ اتنی بڑی کہ میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جدھر نظر دوڑاؤ پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ یہ جھیل اتنی گہری تھی کہ دس ہاتھیوں کو، ایک کے اوپر ایک، کھڑا کر دو تو وہ بھی ڈوب جائیں۔ وہ پہاڑی، جس پر آج منگھو پیر کا مزار دور سے نظر آتا ہے۔ جھیل کے اندر تھی اور ایک چٹان سی معلوم ہوتی تھی۔ اس جھیل میں طرح طرح کی مچھلیاں تھیں۔ چھوٹی، بڑی، لال، پیلی، سنہری، کالی۔ مچھلیوں کے علاوہ اس میں کچھوے تھے اور

بے شمار مگرمچھ بھی رہتے تھے۔

جھیل کے چاروں طرف مچھیروں کی لبتیاں تھیں۔ صبح ہی صبح، سورج نکلنے سے پہلے مچھیرے جھیل پر آتے۔ جال ڈالتے اور مچھلیاں پکڑتے۔ یہی اِن کا کام تھا۔ ان مچھیروں میں ایک بوڑھا مچھیرا تھا۔ جس کا نام منگھو تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ بوڑھا بہت نیک اور بہت رحم دل تھا، لیکن اُس کی بیوی لالچی اور بہت لڑاکا تھی۔ دِن بھر منگھو سے لڑتی اور اُسے بُرا بھلا کہتی رہتی۔ منگھو خاموشی سے سنتا اور خدا کا شکر ادا کرتا۔ وہ بھی دوسرے مچھیروں کی طرح ہر روز صبح کو اُٹھتا، جھیل پر جاتا اور جال ڈالتا۔ جو کچھ ہاتھ آتا۔ کچھ اپنے لئے رکھ لیتا اور باقی مچھلیاں بازار میں بیچ آتا۔

ایک دن بوڑھے مچھیرے نے جال ڈالا تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دوبارہ جال ڈالا اور سمیٹا تو دیکھا کہ جال پھر خالی ہے۔ تیسری بار اس نے خدا کا نام لے کر پھر جال ڈالا تو وہ پھر خالی تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سنہری مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی۔ مچھیرے نے جیسے ہی اسے پکڑنے کی کوشش کی تو مچھلی آدمی کی طرح بولی۔

"اے بابا! میں چھوٹی سی مچھلی ہوں۔ تمہارے کس کام کی۔ اگر تم مجھے جھیل میں واپس ڈال دو تو میں اس احسان کا بدلہ چکا دوں گی۔"

آدمیوں کی طرح مچھلی کو بولتا سُن کر بوڑھے مچھیرے کو بہت تعجب ہوا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ پچاس سال سے وہ روز جھیل میں جال ڈالتا ہے۔ لیکن اِس نے آدمیوں کی طرح بولنے والی مچھلی نہ کبھی دیکھی اور نہ کبھی سنی۔ وہ گھبرا گیا۔ اُس نے جال ڈھیلا کیا اور مچھلی کو جھیل میں ڈال دیا۔ گھر واپس آیا تو ساری بات اپنی بیوی کو سنائی بات سن کر بڑھیا کا پارہ چڑھ گیا۔ بوڑھے مچھیرے کو ڈانٹا پھٹکارا اور کہا۔ "جہنم کے بدّھو تیری عقل پر پتھر پڑیں۔ تجھے مانگنا بھی نہ آیا۔ دیکھا نہیں میرا یہ تسلا کتنا پرانا ہو گیا ہے؟ اِس میں سینکڑوں چھید ہیں جلدی واپس جا اور پھوٹے منہ سے یہ کہہ کہ "اے مچھلی مجھے نیا تسلا دلوا دے۔"

یہ سُن کر بوڑھا اُلٹے قدموں واپس آیا اور جھیل پر پہنچ کر مچھلی کو پکارا۔ جیسے ہی اُس نے آواز لگائی جھیل میں لہریں اُٹھیں اور سونے کی مچھلی دم ہلاتی ہوئی اُس کے سامنے آئی اور بولی "کیوں بابا کیا چاہیئے تم کو؟"

بوڑھے نے کہا "مچھلی رانی! مجھ پر رحم کرو۔ ہمارا تسلا بالکل چھلنی ہو گیا ہے۔ نیا تسلا دلوا دو۔"

مچھلی نے جواب دیا۔ "اچھا بابا! تم غم نہ کرو۔ خیر سے گھر جاؤ۔ جو مانگا ہے وہ مل جائے گا۔"

یہ کہہ کر مچھلی غائب ہو گئی۔ بوڑھا گھر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نیا تسلا بڑھیا کے آگے رکھا ہے

بوڑھا مچھیرا دل ہی دل میں خوش ہوا اور بڑھیا سے پوچھا" اب تو تُو خوش ہے ناں "
یہ سننا تھا کہ بڑھیا غصّے سے لال پیلی ہوگئی۔ کہنے لگی "اے بدّھو! تیری عقل پر پتھر پڑیں۔ تجھے مانگنا بھی نہ آیا۔ مانگا بھی تو یہ دو کوڑی کا تسلا مانگا۔ جلدی جا اور کہہ کہ اے مچھلی! تو نے تسلا تو دلوادیا مجھے ایک اچھا سا گھر اور دلوادے "
یہ سن کر بوڑھا سنّاٹے میں آگیا۔ اُلٹے پاؤں جھیل پر واپس آیا اور آواز لگائی تو وہی مچھلی دُم ہلاتی، بل کھاتی سامنے آئی اور بولی "کیوں بابا! کیا چاہیے تم کو؟"
مچھیرے نے کہا "مچھلی رانی! مجھ پر رحم کرو۔ بڑھیا نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے اب ایک نیا گھر مانگتی ہے۔"
مچھلی نے سنا تو بولی "اچھا بابا۔ تم غم نہ کرو۔ خیر سے گھر جاؤ جو مانگا ہے۔ وہ مل جائے گا۔"
بوڑھا گھر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ جھونپڑی غائب ہے اور اس کی جگہ ایک نیا گھر بنا تیار کھڑا ہے۔ بڑے بڑے کمرے، شیشم کی کھڑکیاں، ساگوان کے دروازے، خوبصورت روشن دان، بڑا صحن، صاف دیواریں اور دیواروں پر رنگین بیل بوٹے، گھر میں داخل ہونے کے لیئے بڑا سا پھاٹک، سارا گھر روشنی سے جگ مگ، جگ مگ کر رہا ہے، گھر میں داخل ہوا تو وہ خوش تھا کہ چلو گھر کا دکھڑا ختم ہوا۔ اب آرام سے زندگی گزرے گی۔
بڑھیا نے جیسے ہی مچھیرے کو دیکھا تو وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی، کہنے لگی "ارے بدّھو! تیری عقل پر پتھر پڑیں۔ تجھے مانگنا بھی نہ آیا۔ مانگا بھی تو یہ گھر مانگا۔ جا اور جلدی جا۔ مچھلی سے جا کر کہہ کہ مجھے دو کوڑی کی مچھیرن رہنا پسند نہیں۔ میں تو اونچے گھر کی رانی بننا چاہتی ہوں اور محل میں رہنا چاہتی ہوں"، بڑھیا زور زور سے چیخنے لگی۔
بوڑھا مچھیرا دبے پاؤں سیدھا واپس آیا اور ڈرتے ڈرتے مچھلی کو پکارا۔ ذرا سی دیر میں لہروں میں ہلچل ہوئی۔ مچھلی دُم ہلاتی، بل کھاتی سامنے آئی اور بولی "کیوں بابا! کیا چاہیئے تم کو؟"
مچھیرے نے ادب سے کہا "اے مچھلی رانی! بڑھیا نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ اب وہ کہتی ہے کہ "اسے دو کوڑی کی مچھیرن رہنا پسند نہیں۔ وہ تو اُونچے گھر کی رانی بن کر محل میں رہنا چاہتی ہے"
مچھلی یہ سن کر بولی "اچھا بابا! تم غم نہ کرو، خیر سے گھر جاؤ۔ جو مانگا ہے وہ مل جائے گا"
بوڑھا مچھیرا گھر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر کی جگہ ایک اونچا سا محل کھڑا ہے اور بڑھیا بڑے ٹھسے سے

زینے پر کھڑی ہے۔ کلائی میں سونے کے موٹے موٹے کڑے۔ گلے میں ہیروں اور سچّے موتیوں کا ہار۔ ریشمی کپڑے ہاتھ میں انگوٹھیاں، پاؤں میں لال جوتی۔ سر پر بڑا سا جوڑا، آگے پیچھے نوکر چاکر، خدمت میں مصروف۔ بڑھیا کبھی اس نوکر کو ڈانتی ہے۔ کبھی اُس کو بُرا بھلا کہتی ہے اور سب کو حکم دے رہی ہے

بوڑھا مچھیرا اس کے پاس گیا اور بولا" سرکار کی خیر ہو۔ اب تو راضی ہونا"؟

یہ سنتے ہی بڑھیا غصے سے لال پیلی ہوگئی۔ بوڑھے کو دھتکارا اور نوکروں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کو اصطبل میں رکھو اور اس سے کہو کہ گھوڑوں کے لئے بھوسا چارہ کاٹے اور وہیں رہے۔

بوڑھا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور اصطبل میں رہنے لگا۔ جب رہتے رہتے پندرہ دن ہوگئے تو بڑھیا نے اسے پھر بلوایا اور حکم دیا کہ" جا اور مچھلی سے کہہ مجھے جھوٹ موٹ کی رانی بننا پسند نہیں۔ میں تو سچ مچ کی مہارانی بننا چاہتی ہوں۔ ایسی مہارانی جس کا راج ہو اور حکم چلتا ہو"۔

بوڑھے نے سنا تو سنّاٹے میں رہ گیا۔ آہستہ سے بولا" بڑھیا تو کیا گھاس کھا گئی ہے؟ نہ تجھے بات کرنا آتی ہے۔ نہ اُٹھنا بیٹھنا آتا ہے۔ بوڑھی گھوڑی اور لال لگام ساری دنیا تجھ پر ہنسے گی"۔

یہ سنا تو بڑھیا کو غصہ آگیا۔ بڈھے کے منہ پر زور سے ایک چانٹا مارا اور کہا۔" افوہ! بڑی سرکار کے آگے تیری یہ ہمت۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ جا! تیری خیریت اسی میں ہے کہ جو حکم تجھے دیا گیا ہے، اسے پورا کر، ورنہ میرے نوکر تیری ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔ جانا ہے یا پھر"۔

یہ سُن کر بوڑھا دونوں کانوں کو دبائے جھیل پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ جھیل کا سارا پانی کالا سیاہ ہوگیا اور اس میں زور سے لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ بوڑھے نے ڈرتے ڈرتے مچھلی کو پکارا، مچھلی دم ہلاتی بل کھاتی سامنے آئی اور بولی" کیوں بابا! کیا چاہئیے تم کو؟

بوڑھا گردن جھکا کر بولا" اے مچھلی رانی! بڑھیا کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اب کہتی ہے کہ" اونچے گھر میں کیا رکھا ہے۔ میں تو سچ مچ کی مہارانی بننا چاہتی ہوں۔ جس کا راج ہو اور سارے راج میں اس کا حکم چلتا ہو"۔

یہ سن کر مچھلی بولی" اچھا بابا! یوں ہی سہی۔ تم غم نہ کرو خیر سے گھر جاؤ جو مانگا ہے وہ مل جائے گا"۔

بوڑھا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے شاہی محل کھڑا ہے اور محل میں اُس کی بڑی بی، سر پر تاج لگائے بیٹھی ہے۔ دائیں بائیں درباری کھڑے ہیں۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے۔ پیٹی کسی ہوئی۔ سر پر پگڑی کسی کے مونچھیں، کسی کے داڑھی۔ اور سب ہاتھ باندھے مہارانی کے سامنے کھڑے ہیں اور

مہارانی تخت پر بیٹھی پستے بادام کھا رہی ہے۔ بوڑھا مچھیرا آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر سامنے آیا اور بولا
"مہارانی اب تو راضی ہونا"
یہ سننا تھا کہ بڑھیا غصے سے لال پیلی ہوگئی اور حکم دیا کہ اس کہ اس بڈھے کو میرے سامنے سے دور کردو"
درباریوں نے بوڑھے کو پکڑا اور دھکے دیتے ہوئے محل سے باہر نکال دیا۔
بوڑھا وہاں سے چلا آیا اور ایک جھونپڑی میں اکیلا رہنے لگا۔ جب ایک مہینہ گزر گیا تو بڑھیا مہارانی نے حکم دیا کہ "بوڑھے کو حاضر کرو"
چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے۔ ایک ایک جگہ تلاش کیا۔ کئی دِن کے بعد سپاہی اسے پکڑ کر لائے اور بڑھیا کے سامنے پیش کیا۔ جیسے ہی بڑھیا مہارانی نے مچھیرے کو دیکھا تو اکڑ کر بولی "او بڈھے مچھیرے! سنتا ہے؟ فوراً جا اور مچھلی سے کہہ کہ میں مہارانی بن کر بھر پائی۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں سات سمندروں پر حکومت کروں۔ سب جگہ پر میرا راج ہو۔ ہر طرف میرا حکم چلے اور سونے کی مچھلی میری خدمت گار بن کر ہر وقت میرے سامنے رہے۔ جو حکم اسے دوں وہ بجا لائے"
یہ سننا تھا کہ بوڑھا چکرا کر رہ گیا اُس کی کیا مجال کہ مہارانی سے کچھ کہے۔ چپ سادھے جھیل پر آیا کیا دیکھتا ہے کہ جھیل کا سارا پانی کالا سیاہ ہوگیا ہے اور ساری جھیل میں ایک طوفان اُٹھ رہا ہے لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ ڈراؤنی آوازیں چاروں طرف سے آرہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کی ساری بستی ڈوب جائے گی۔
بوڑھے نے ڈرتے ڈرتے آواز لگائی۔ ذرا دیر میں کیا دیکھتا ہے کہ سونے کی مچھلی دُم ہلاتی، لہراتی اُس کے سامنے آئی اور بولی "کیوں بابا کیا چاہیئے تم کو"
بوڑھے مچھیرے نے ادب سے کہا کہ "اے مچھلی رانی! میری بیوی نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ روز نئی نئی باتیں کرتی ہے۔ اب وہ کہتی ہے کہ میں مہارانی بن کر بھر پائی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ سات سمندروں پر میری حکومت ہو اور اے پیاری مچھلی! تو خدمت گار بن کر اس کا ہر حکم بجا لائے"
یہ سن کر مچھلی نے پٹ پٹ آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر غور سے بوڑھے کو دیکھتی رہی اور پھر۔۔۔ پھر ایک دم غائب ہوگئی۔
بوڑھا مچھیرا وہاں بہت دیر تک اس کے انتظار میں کھڑا رہا دوبارا اسے پکارا۔ مگر مچھلی۔۔۔ مچھلی پھر نہ آئی۔

بوڑھا منہ لٹکائے گھر کو آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں نہ محل ہے، نہ نوکر چاکر ہیں۔ وہی پرانی جھونپڑی ہے۔ بڑھیا جھونپڑی کی چوکھٹ پر اکیلی بیٹھی ہے اور وہی ٹوٹا پھوٹا پرانا تسلا اس کے سامنے رکھا ہے اور پھر یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصے میں بڑی سی جھیل سوکھ کر چٹیل میدان بن گئی۔ سارے پیڑ سوکھ گئے بستی ویران ہو گئی۔ صدیوں سے وہاں رہنے والے مچھیرے بستی چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اب وہاں صرف تالاب باقی ہے۔ جس میں مگرمچھ تیرتے رہتے ہیں۔ قریب ہی نیک دل منگھو کا مزار ہے۔ جو سارے علاقے میں منگھو پیر کے نام سے مشہور ہے۔ کراچی، سندھ اور لسبیلہ کے لوگ منتیں ماننے کے لئے منگھو پیر کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

---

# حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا
مقبول ترین سلسلۂ تحریر
اخلاق احمد کی مہمّاتی کہانیوں کا

## دلچسپ مجموعہ

برائیوں سے برسرِ پیکار
۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
حسین سرورق ۔ اعلیٰ طباعت
حق اسکواڈ کے حصول کے لیے
دس روپے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے،

ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتہ

گرین گائیڈ اکیڈمی

ڈی، ۱۱۲ فورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

# ہماری نیند ہمارے خواب

شین فاروقی

دنیا کے تقریباً تمام افراد ہر روز آٹھ دس گھنٹے کے لیے عارضی طور پر انتقال فرما جاتے ہیں۔ آپ بھی یقیناً ان افراد میں شامل ہیں۔ بھئی بُرامت منائیے۔ آپ کے انتقالِ پُر ملال سے ہماری مراد نیند یا سونے کی کیفیت ہے۔

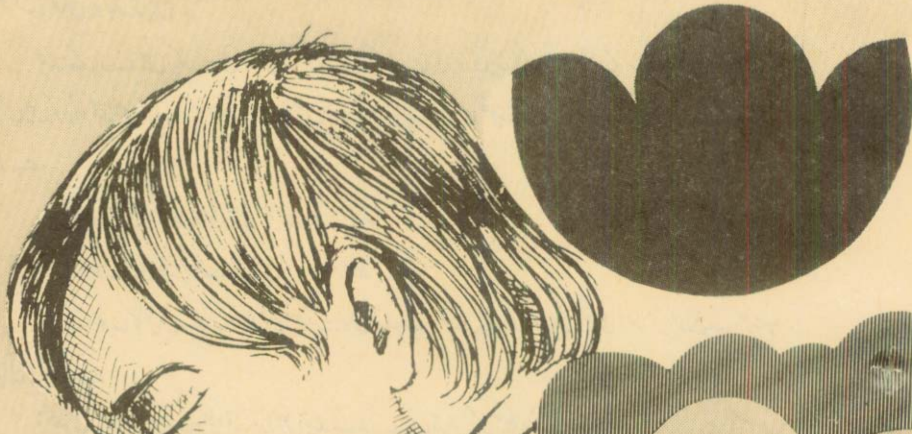

دنیا کے کئی بڑے فلسفیوں اور شاعروں نے نیند کو عارضی موت سے تعبیر کیا ہے۔

نیند کے عالم سے ایک اور دنیا کا تصور وابستہ ہے۔ خوابوں کی دنیا کا۔ رنگ برنگے، اوٹ پٹانگ، مزیدار، اور ڈراؤنے خوابوں کی دنیا کا۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں عجیب و غریب واقعات، لوگوں اور اشیائے سے آپ کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جس میں ہر فرد کبھی نہ کبھی زیرو سے ہیرو بن جاتا ہے۔ یہ دنیا بہت واضح اور حقیقی ہونے کے باوجود معمے کی طرح پیچیدہ ہے۔

انسان ہزاروں سال سے نیند اور خواب کے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ابھی تک وہ اس معمے کو مکمل طور پر حل نہیں کر سکا ہے

پچھلی کئی صدیوں سے انسانی زندگی میں نیند کی نوعیت اور اہمیت کے سلسلے میں کئی سائنسی مفروضے موجود رہے ہیں۔ ان مفروضوں کے مطابق نیند ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں انسانی ذہن آرام کی حالت میں آجاتا ہے۔ اور انسانی جسم کے باقی تمام اعضاء اگلے دن کے لیے توانائی جمع کرنے کی غرض سے غیر متحرک ہوجاتے ہیں۔ یہ مفروضے بڑی حد تک درست ہیں لیکن ان میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر حالیہ برسوں میں سائنسی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ نیند کی حالت میں انسانی دماغ کے بعض خلیے بیداری کی حالت سے زیادہ متحرک یا فعال ہوجاتے ہیں۔

نیند کے بارے میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری پوری نیند ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ یا اس میں کوئی وقفہ بھی آتا ہے؟ اس سلسلے میں ہونے والی جدید ترین تحقیقات نے نیند کے دو مرحلوں کی نشاندہی کی ہے۔

۱ آنکھوں کی تیز حرکت والی یعنی REM نیند

۲ آنکھوں کی آہستہ حرکت والی یعنی NREM نیند

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان تیز حرکت والی نیند کے عالم میں ہی خوابوں کی رنگین، علامتی اور عجیب و غریب دنیا کی سیر کرتا ہے۔

آنکھوں کی آہستہ حرکت والی نیند دراصل نیند کے بارے میں قدیم یا کلاسیکی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق اس نیند کے دوران انسانی ذہن میں ہر وقت جاری رہنے والی برقی لہروں کی سرگرمی مدھم پڑجاتی ہے۔ انسان کا اعصابی تناؤ، نبض اور نظامِ تنفس آہستہ رو ہوجاتا ہے اور آنکھوں کے ڈھیلے ساکت ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس آنکھوں کی تیز حرکت والی نیند میں انسانی نظام کے یہ تمام اعضاء NREM نیند کی حالت کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ اور بقول سائنس دانوں کے اس نیند کے عالم میں انسان جاگنے کی کیفیت کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس لیے اس نیند سے جاگنے کے بعد انسان کو اپنے اکثر خواب یاد رہ جاتے ہیں جب کہ آنکھوں کی آہستہ حرکت والی نیند سے جاگنے والے کو اپنے خواب یاد نہیں رہتے۔

تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ NREM نیند کے عالم میں اور خاص طور پر اس نیند کے اختتام پر انسانی جسم مکمل آرام کی حالت میں ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر انسان کو رات میں یہ نیند میسر نہ آئے تو وہ صبح اُٹھ کر جسمانی طور پر خود کو کمزور اور ذہنی طور پر پژمردہ محسوس کرتا ہے۔

چند برس پہلے بوسٹن یونیورسٹی کے دو پروفیسروں آر گرین برگ اور سی پرل مین نے تجربات کے بعد خیال ظاہر کیا تھا کہ آنکھوں کی تیز حرکت والی نیند جس میں انسان کو زیادہ خواب آتے ہیں دراصل انسان کو دن میں پیش آنے والے مختلف

حالات کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ نیز ان معلومات کو جذب کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے جنہیں انسان بیداری کے عالم میں جذب کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان صاحبان کا کہنا ہے کہ سونے سے پہلے انسان کو پیش آنے والے مسائل یا معاملات کا خوابوں سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور فرد جو خواب دیکھتا ہے اس کی نوعیت زیادہ تر نفسیاتی ہوتی ہے۔ فرد کی جیسی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے اس کے خواب بھی ویسے ہی ہوتے ہیں۔

روس کے دو سائنس دانوں نے تقریباً ایک سال تک بہت سے بیمار اور صحت مند افراد کے رویّوں اور جذباتی ردِّ عمل پر تحقیق کی۔ تحقیق کے بعد انہوں نے افراد کو دو درجوں میں تقسیم کیا۔

ایک وہ افراد جو مشکل حالات سے نجات پانے کے لیے سرگرمی سے جدّوجہد کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایسا نہیں کرتے۔ تحقیق کے مطابق بعد والی قسم کے افراد نامعلوم وجوہات کی بناء پر جدّوجہد کو ترک کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنے اعصابی نظام اور ہمّت کو مکمل طور پر خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ افراد اپنی مشکلات پر قابو پانے سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ بیماری سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ انسان اپنے اندر پیدا ہو جانے والی مختلف پیچیدگیوں سے صرف اُسی صورت میں بہتر طریقے سے نپٹ سکتا ہے، جب اُس میں تلاش، جستجو اور جدوجہد کا رجحان موجود ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سائنس دان REM نیند کو خوابوں کے ساتھ منسلک بتاتے ہیں اور اس کا رشتہ انسان میں پائے جانے والے تلاش اور جستجو کے رجحان سے جوڑتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق انسان ذہن کے اندر تلاش یا جستجو کے وقت جو عمل واقع ہوتا ہے REM نیند کے دوران بھی انسانی ذہن میں ٹھیک ویسا عمل رونما ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر حضرات شدید ڈپریشن اور ذہنی خلجان کا شکار ہونے والے مریضوں کے لیے REM نیند کو فائدے مند تصور کرتے ہیں۔

خیال ہے کہ کسی شدید صدمے سے متاثر ہونے کے بعد انسان کسی ایسی نیند میں مبتلا ہو سکتا ہے جو کئی روز بلکہ کئی مہینوں تک جاری رہ سکتی ہے۔ تاہم نیند کی یہ شکل بھی جو کہ موت سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔ جاگنے کی حالت سے قریب ہوتی ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں انسانی دماغ کا بایاں حصّہ منطقی یا عقلی انداز میں سوچنے کا عادی ہے اور دایاں تصوّراتی انداز میں سوچنے کا۔ خیال ہے کہ جب انسان میں منطقی انداز میں سوچنے کی صلاحیت کسی پریشانی کو حل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو انسانی ذہن تصوّراتی فکر کی مدد حاصل کرتا ہے۔ ہم اس حالت کو ایک مثال کی مدد سے واضح کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک صاحب بہت غریب ہیں۔ غربت سے نجات پانے کے لیے یہ صاحب دن رات محنت کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ غور و فکر بھی لیکن اُن کی غربت دُور نہیں ہو پاتی۔ ایسی صورت میں یہ صاحب آہستہ آہستہ تصوّراتی دنیا میں کھونے لگیں گے۔ مثلاً وہ بعض نہایت خیالی صورتیں فرض کر لیں گے۔ جیسے اُن کی لاٹری نکل آئی یا انہیں کہیں سے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مل گیا وغیرہ۔ اس تصوّراتی عمل کے ذریعہ یہ صاحب اپنے ذہن میں پیدا ہو جانے والی

بے چینی اور بے ترتیبی میں توازن پیدا کریں گے اگر یہ صاحب ایسا نہیں کر پائیں گے تو امکان ہے کہ مسائل کی شدت سے وہ کسی دن اپنا ذہنی توازن کھودیں گے۔

خیال ہے کہ انسان کے اس مخصوص نفسیاتی عمل کا تعلق انسانی عقل سے زیادہ انسان میں پائے جانے والے شوخ جذبات سے ہے۔ ماہرین کے مطابق انسان کے خوابوں اور اس کی اندرونی بے چینی کے درمیان جس قدر کم تعلق ہوگا انسان کو پیش آنے والی پیچیدہ صورتِ حال کے حل ہونے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اگر ایک شخص بہت خواب دیکھتا ہے اور انہیں یاد بھی رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی REM نیند اپنا مقصد ٹھیک طریقے سے پورا کررہی ہے۔ لیکن اگر کسی انسان میں تلاش اور جستجو کا مادّہ کمزور پڑجائے تو پھر ڈراؤنے خواب اس شخص کا مقدّر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح نامکمّل یا بے ہنگم خواب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان میں موجود جدّوجہد کی صلاحیت ناکام ہوچکی اور اسے اب اپنی راہ بدل لینی چاہیے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہُوا ہے کہ انسان خواب جیسے عمل سے REM نیند کے دوران بھی دوچار ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ نیند کا یہ حصّہ REM نیند کے کچھ حصوں کے ساتھ مل کر انسانی ذہن میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں آنے والے خواب انسان کے اُن جذباتی تجربات کا بچا کھچا حصّہ ہوتے ہیں جو REM نیند کے حصّے میں ظاہر ہوئے تھے۔ تاہم یہ ایک مفروضہ ہے جس میں مزید ترقی کی گنجائش ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو ایک بات طے ہے کہ دونوں اقسام کی نیندیں انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے لازمی ہیں۔ چنانچہ آپ آئن اسٹائن کی طرح رات کو بستر پر جانے سے قبل اپنے تمام مسائل اور فکرات کو گڈ بائی کہہ دیا کریں تاکہ آپ نارمل نیند کے مزے لُوٹ کر اپنی ذہنی و جسمانی صحت کو برقرار رکھ سکیں۔

# تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف:۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مُفت منگوانے کے لیے
صرف ۳۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کردیجئے۔

قسط وار ناول

قسط نمبر ۱

# ڈاڑیل

نعیم بلوچ

"دھاڑیل" بہ معنی "ڈاکو"

سندھ کے پس منظر میں لکھا گیا ایک پُر تجسس سلسلۂ تحریر

**مئی** کا سورج آگ برسا رہا تھا۔ تپتی دوپہر سے بچنے کے لیے لوگ اپنے گھروں میں اور چرند پرند اپنے گھونسلوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ایسے میں غریب جانو، تیز تیز قدم اُٹھاتا وڈیرے رسول بخش کی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی ماں کئی مہینوں سے بیمار تھی۔ دوا ختم ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ جب ماں کھانس کھانس کر بے ہوش ہو گئی تو وہ مزید برداشت نہ کر سکا۔ فوراً وڈیرے کے گھر کی طرف بھاگ اُٹھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وڈیرے کے کمدار نے دوا کے لیے رقم نہ دی تو اُس کی ماں مر جائے گی۔ کمدار سے اُسے کچھ ملنے کی امید تو نہ تھی، لیکن وہ اس خیال سے گھر سے چل پڑا تھا کہ جب میں اپنی ماں کی حالت بتاؤں گا تو ہو سکتا ہے کہ اُسے ترس آ ہی جائے۔

انہی سوچوں میں جانو جیسے ہی کمدار کی کوٹھری میں داخل ہوا، وہ اپنا حساب کتاب روک کر اُس پر برس پڑا "حرام خور، ابھی تو پچھلے دنوں ماں کے لیے روپے لے کر گیا تھا۔ آج ایک پائی بھی نہ دوں گا۔ مرتی

ہے تو مر جائے تیری ماں ۔ اچھا ہی ہو گا ایک کھانے والا کم ہو جائے گا "

جانو حویلی سے باہر نکلا تو اُس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا ۔ "اے خدا تو نے ہمیں اتنا مجبور اور بے بس کیوں پیدا کیا ؟ وہ اپنی قسمت پر افسوس کرنے لگا ۔ جب سے آنکھ کھولی تھی غربت ، بیماری اور فاقے ہی دیکھے تھے ۔ ذرا بڑا ہوا تو باپ کو پولیس والوں نے مار دیا اور اب اس بھری پُری دنیا میں وہ اپنی بیمار ماں اور تین بہنوں کے ساتھ بے سہارا ہی تو تھا ۔ کیسی دُکھ بھری زندگی تھی یہ ۔

" کہاں جا رہے ہو جانو ؟ ایک آواز نے اُسے پکارا ۔ اس آواز میں کیسی شفقت اور اپنائیت تھی اُس نے مُڑ کر دیکھا ۔ گوٹھ کا مشہور ہندو بیوپاری رام چند کھڑا تھا ۔ وہ ہمیشہ ہی اُس سے بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا ۔ خاص طور پر باپ کے مرنے کے بعد تو اُس کا رویّہ اس کے ساتھ اور بھی ہمدردی کا ہو گیا تھا ۔ جانو اُس کٹی ہوئی پتنگ کی طرح جو ہوا کے تیز جھونکے میں ڈولتی ڈگمگاتی غوطہ لگا کر زمین سے جا ٹکراتی ہے ، رام چند ، کے بازوؤں میں گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔

" میری ماں مر جائے گی اڈا " وہ ہچکیاں لے لے کر کہہ رہا تھا ۔ رام چند نے اُسے تسلّی تشفی دی اور ساری کہانی سننے کے بعد جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور اُسے دیتے ہوئے کہنے لگا :" یہ لے جاؤ اور شام کو میرے پاس آنا ۔ میں نے تمہارے لیے ایک ملازمت کا بندوبست کیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں آج رات ہی کہیں جانا پڑ جائے ۔ اس لیے گھر والوں کو بتا کر آنا ۔ جاؤ اب دیر مت کرو ۔ ماں کو دوا لا کر دو ۔ جانو کو اس وقت رام چند آسمان سے بھیجا ہوا رحمت کا فرشتہ نظر آ رہا تھا ۔ بھرّائی ہوئی آواز میں اُس نے رام چند کا شکریہ ادا کیا ۔ اور گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا ۔

شام کو جانو ، رام چند کے ہاں گیا تو اوطاق میں چار آدمی پہلے سے موجود تھے ۔ تین آدمیوں کی عمریں تو تیس سے چالیس سال کے درمیان ہوں گی ، البتہ چوتھے کی عمر جانو جتنی ہی ہو گی یعنی اٹھارہ ، اُنیس برس ۔ بڑی عمر کے آدمیوں کے پاس بندوقیں تھیں ۔ لڑکے کے پاس اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی ۔ وہ بھی جانو کی طرح اُن آدمیوں میں اجنبی لگ رہا تھا ۔

" سائیں ، یہ ہے ہمارا بیٹا جانو ، آج سے یہ تمہارا ہے ۔ خیال رکھنا اس کا ، بڑی کام کی چیز بنے گا "

رام چند نے گھنی مونچھوں والے ایک آدمی سے اس کا تعارف کروایا ۔

" وہ تو ٹھیک ہے ، لیکن اس کی ضمانت کون دے گا ؟"

" ضمانت ؟ رام چند ہنسا " سائیں قادر ! کیا میرا بھیجا ہوا کوئی بھی آدمی آج تک غلط نکلا ہے ؟

"ہاں، میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے نا" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوبارہ کہنے لگا...
"دوستوں کی طرف سے کوئی پیغام آیا ہے؟"

رام چند کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"ٹھیک تین روز کے بعد آنا اور جانو کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ تمہیں دوستوں کا پیغام بھی مل جائے گا۔ اور ہاں بھئی ... یہ نیا بچہ کون ہے"؟ اس کا اشارہ جانو کے ہم عمر لڑکے کی طرف تھا۔

"یہ سیٹھ موہن داس کی دریافت ہے۔ منظور۔ ہم ابھی انہی کے ہاں سے آرہے ہیں... اچھا اب ہم چلتے ہیں"

باہر جیپ ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ جانو اور منظور کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ جب جیپ گوٹھ سے باہر نکلی تو دونوں لڑکوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ جیپ کس راستے سے کہاں جا رہی تھی؟ جانو کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ البتہ اسے اتنا ضرور معلوم ہوچکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے ایک بہت بڑے گروہ میں شامل ہوچکا ہے۔ ڈاکو بننا اُس کی گوٹھ کے لوگوں کے ہاں کوئی بُری بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ جس طرح محنت مزدوری کر کے روزی کمائی جاتی ہے، اسی طرح ڈکیتی بھی کمائی کا ایک ذریعہ ہے، لیکن جانو کا باپ وسایا، ڈاکوؤں کو بُرا سمجھتا تھا۔ اُسے جانو کو تعلیم دلوانے کا بہت شوق تھا۔ لیکن جب اُس نے جانو کو دُور کے ایک اسکول میں داخل کرایا تو وڈیرہ سخت ناراض ہوا۔ اُس نے وسایا کو دھمکی دی کہ اگر اُس نے اپنے بیٹے کو کھیتی باڑی کے کام میں نہ لگایا تو وہ اُسے اپنی زمین کاشت کرنے کے لیے نہیں دے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اُس نے جانو کو اسکول سے اُٹھا لیا۔۔۔ جانو خود بھی پڑھنے کا شوقین تھا۔ اسکول چھوڑنے کا اُسے بہت صدمہ ہوا۔ لیکن ابھی تو اُسے بہت سے صدمے جھیلنے تھے۔ اسکول چھوڑنے کے کچھ ہی دنوں بعد اُس کے باپ کو پولیس نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ وسایا ڈاکوؤں کا ساتھی تھا۔ چنانچہ پولیس کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا۔ لیکن جانو ہی نہیں سارا گوٹھ جانتا تھا کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ وسایا، جانو کا باپ ڈاکوؤں کا کبھی ساتھی نہیں ہوسکتا تو پھر پولیس نے اُس کے باپ کو کیوں قتل کیا؟ اُس نے ایسا کیا جُرم کیا تھا؟ جانو کے ذہن میں یہ سوالات چکراتے رہتے تھے اور کسی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور آج جب وہ خود ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ڈاکو نہ بھی بنا تو بھی باپ کی طرح اُسے ڈاکوؤں کا ساتھی کہہ کر مار دیا جائے گا۔ تو پھر ایک کمزور اور بے بس آدمی کی طرح زندہ رہنے کا کیا فائدہ؟ ہوسکتا ہے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے بعد اُسے کبھی نہ کبھی پولیس اور وڈیرے سے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کا موقع مل سکے۔

"سائیں تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

جانو چونک پڑا۔ منظور اس سے مخاطب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"باتیں نہیں کرنی۔ چُپکے بیٹھے رہو۔" جانو اور منظور ایک دَم سہم گئے۔

جیپ کی رفتار اب کم ہورہی تھی اور پھر چند منٹوں کے بعد جیپ رُک گئی۔ اُنھیں آنکھوں پر بندھی پٹیاں اُتار کر نیچے اُترنے کو کہا گیا۔

جانو اور منظور نے پٹیاں اُتاریں تو اُنہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ لیکن جیپ کی لائیٹس کی روشنیوں میں اُنہیں اندازہ ہوا کہ وہ پہاڑی علاقے میں ہیں اور ان کی جیپ ایک بڑے سے غار کے سامنے کھڑی ہے۔ پھر ایک آدمی نے اپنے منہ سے اُلّو کی آواز نکالی۔ تیسری آواز پر ایک آدمی ہاتھ میں ٹارچ پکڑے غار سے باہر آگیا۔ اس کے پیچھے پانچ آدمی اور تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں جدید قسم کی بندوقیں تھیں۔ جب جانو سب ڈاکوؤں کے ساتھ غار کے اندر داخل ہُوا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ غار ایک بہت بڑے کمرے کی طرح تھا۔ مدّھم مدّھم سی روشنی سارے غار میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روشنی غالباً بیٹری کے ذریعے کی گئی تھی۔ جانو حیرانی سے ابھی غار کو دیکھ رہا تھا کہ اُسے ایک چٹائی پر بیٹھ جانے کو کہا گیا۔ مونچھوں والا ڈاکو، جو اُسے رام چند کے گھر سے لایا تھا، اُن کا سردار تھا۔ اُس نے ایک دوسرے ڈاکو کو حکم دیا کہ وہ نئے ساتھیوں کو آج کے کام کی تفصیل بتائے اور خود وہ کچھ اور کرنے غار کے دوسرے کونے کی طرف چلا گیا۔ جہاں ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔

جانو اور منظور سے اُن کے نام پُوچھ کر اُنہیں آج کے کام کے متعلق بتایا جانے لگا۔

"مجھے اسکول میں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔" غار سے نکلتے ہوئے جانو نے منظور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ استادوں کے نہیں ڈاکوؤں کے اسکول میں پڑھنا پڑے گا۔"

رات کے تقریباً تین بجے ہوں گے مرکزی شاہراہ پر ایک بس اُڑی جارہی تھی۔ چند ایک کے سوا سارے مسافر سو رہے تھے۔ ڈرائیور چاق و چوبند تھا۔ اس کی نظریں بار بار فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دونوں سپاہیوں کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ دونوں اُونگھ رہے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ سپاہیوں پر نظر پڑتے ہی ڈرائیور کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگتا تھا۔

ڈرائیور نے بس کی رفتار کم کردی۔ آگے سڑک خم کھاتی ہوئی سیدھی ہورہی تھی۔ بس جب سڑک کے دوبارہ سیدھا ہونے پر رفتار پکڑنے لگی تو اچانک ڈرائیور کا پاؤں ایکسیلیٹر کے بجائے بریک پر جا لگا۔ لیکن ایسا اُس نے بھُولے سے نہیں، جان بُوجھ کر کیا تھا۔ آگے رکاوٹیں کھڑی کر کے سڑک کو بند کر دیا گیا تھا۔ بس کے جھٹکے کے ساتھ رُکتے ہی دونوں سپاہی ایک دَم چوکنے ہو گئے۔

"کیا بات ہے۔ گاڑی کیوں روک دی" ایک سپاہی غرّایا" آگے سڑک بند ہے" ڈرائیور نے لاتعلقی سے کہا۔ یہ سُنتے ہی دونوں سپاہی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور ڈرائیور کو حکم دیا۔

"گاڑی کو کچے میں اُتار لو..."

"کچے میں گڑھے ہیں۔ گاڑی پھنس جائے گی"

"ڈرائیور گاڑی کو بیک کر لو۔ جلدی کرو" دوسرا سپاہی دھاڑا۔

"تمام مسافر سیٹوں کے نیچے گھس جائیں۔ ڈاکوؤں نے سڑک روک رکھی ہے۔"

## نام بھی انعام بھی

آنکھ مچولی کے مقابلۂ تحریر میں ساتھیوں نے "سفر نامے" کے عنوان کے تحت بہت سے سفرنامے ارسال کئے۔ تمام سفرناموں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد تین تحریروں کو انعامات کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ "سفر نامہ لندن کا" سلمان غزالی (کراچی) پہلا انعام

۲۔ "کراچی کی سیر" شفیق احمد قریشی (مقام نامعلوم) دوسرا انعام

۳۔ "سفر نامۂ آسٹریلیا" سعدیہ عروسہ سعیدی (راولپنڈی) تیسرا انعام

انعام یافتگان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے شناختی کارڈ کی نقل ارسال کر دیں، اور ساتھ ہی ایک حلف نامہ بھی جس میں اس کی یقین دہانی کرائی جائے کہ ان کا سفرنامہ (الف) طبعزاد ہے (ب) اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا۔

ادارہ انعام یافتگان کو تہہِ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔

# چہرے بھی کھائیں
# جُوتے بھی کھائیں

سلمیٰ سلیم

ریفری نے جیسے ہی سیٹی بجائی ہال میں موجود بہت سے لوگ میزوں پر رکھے ہوئے انسانی چہرے اور جُوتے کھانے کے لیے دوڑ پڑے اور چند ہی لمحوں میں وہ سب چہروں اور جوتوں کو مزے لے لے کر ہڑپ کر گئے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس ہولناک منظر کے اختتام پر ان میں سے تین افراد کو اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق بھی قرار دیا گیا۔

آپ سوچ رہے ہونگے کہ یہ شاید افریقہ کے جنگلوں میں موجود کسی وحشی قبیلے کے افراد ہوں گے۔ ہرگز نہیں۔ یہ سب لوگ امریکہ جیسے مہذب معاشرے کے لوگ تھے۔ خیر یوں تو امریکی لوگوں سے ہر عمل کی توقع کی جاسکتی ہے مگر پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے انسانی چہرے اور جُوتے کیسے کھائے؟ پریشان نہ ہوں یہ اصلی چہرے اور جُوتے نہیں تھے بلکہ یہ کھانے کی مختلف چیزوں سے تیار کیے گئے چہرے اور جُوتے تھے۔

گزشتہ دنوں واشنگٹن ڈی سی کے لوگوں نے طے کیا کہ ایک دن کھانے پینے کی مختلف اشیاء سے انسانی چہرے، حیوان، اور دیگر اشیاء بنانے کا ایک مقابلہ منعقد کیا جائے۔ اس مقابلے کا مقصد یہ تھا کہ فنکارانہ ذہن رکھنے والے افراد کی تخلیقی صلاحیتوں کو جِلا ملے اور خوب مزا بھی آئے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق مقابلہ منعقد ہوا۔ جس میں بہت سے لوگ طرح طرح کی چیزیں بنا کر لائے ...

برابر کے صفحہ پر موجود انسانی چہرے کو اوّل انعام کا حق دار سمجھا گیا۔ اس چہرے کے ہونٹ گوندھے اور باقی اکثر چیزیں اُبلے ہوئے اور پسے ہوئے چاولوں سے بنائی گئی ہیں۔ اس صفحہ پر موجود جُوتے چاکلیٹ سے اور جو ہا مختلف میٹھی اشیاء سے بنایا گیا ہے۔

اگر آپ کے پاس بھی تخلیقی ذہن اور تھوڑی فرصت ہے تو آپ بھی کھانے پینے کی اشیاء سے دلچسپ چیزیں بنا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ بھی چیزیں بنانے کے لیے وہی اشیاء استعمال کریں جن سے آنکھ مچولی کے صفحہ پر موجود اشیاء کو بنایا گیا ہے۔ آپ آسانی سے دستیاب ہونے والی دوسری چیزوں کو کام میں لا سکتے ہیں۔

ہم آپ کو کھانے کی مختلف اشیاء سے ایک خوبصورت سینری اور گدھا بنانے کی ترکیب بتا رہے ہیں۔ لیکن آپ چاہیں تو اپنی پسند کی کوئی اور چیز بنا سکتے ہیں کوشش کیجیے شاید آپ کے گھر میں آپ کی ذہانت کی دھاک بیٹھ جائے۔ ہاں البتہ اتنی سی گزارش ہے کہ برائے مہربانی جُوتے مت بنائیے گا کیونکہ اس صورت میں ہم آپ کے امی ابّو یا گھر کے دیگر بڑے افراد کے "محبت بھرے سلوک" کے ذمّے دار نہ ہوں گے۔

# غذا کی غذا مزے کا مزا

مسکراتا ہوا چہرہ، ایک وقت کی
اچھی غذا

پانچ منزلہ مینار جسے کھانے کے
بعد ہر شخص انگلیاں چاٹنے لگے گا۔

میٹھا چوہا جس کا
گھر بل نہیں
ہمارا پیٹ ہے

وہ جوتے جو ہم
سب کھانا
پسند کریں گے

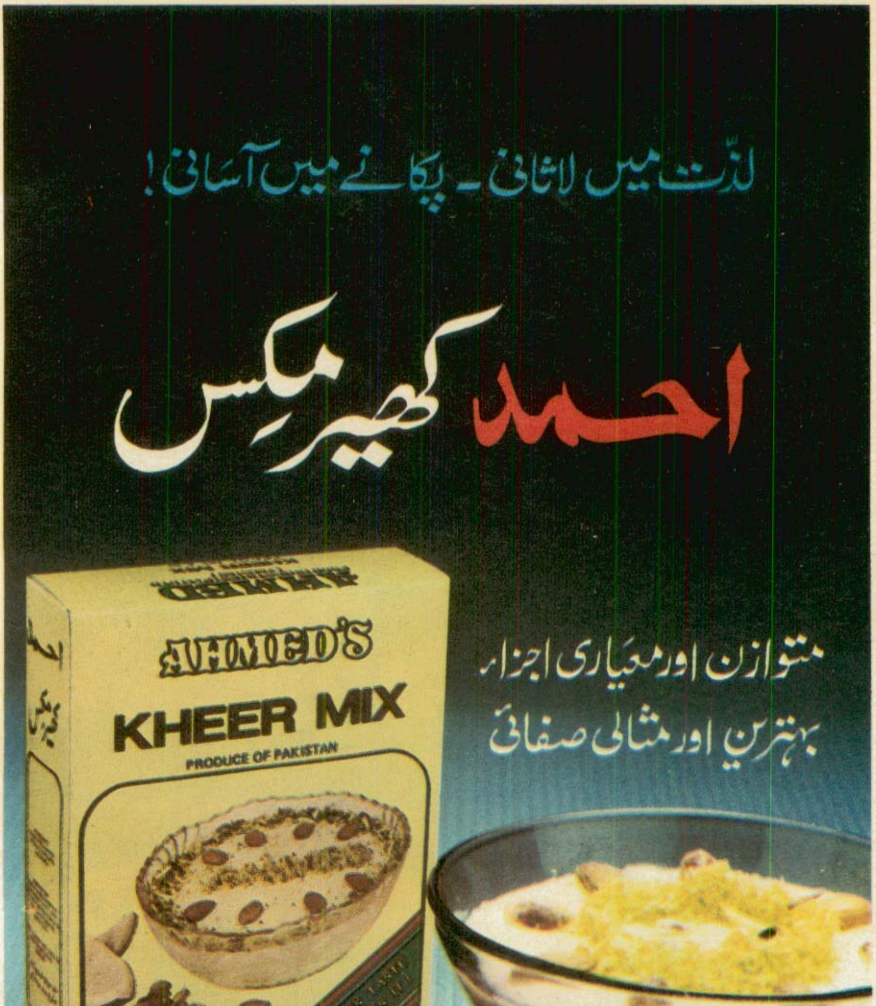
لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی !
احمد کھیر مکس
AHMED'S
KHEER MIX
PRODUCE OF PAKISTAN
NATURE PRODUCES TASTE
AHMED PRESERVES IT!
READY TO COOK
متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی
احمد
کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت !
MASS
Scancraft

## انعامی لطیفہ

بس اسٹاپ پر بہت بھیڑ تھی۔ بس آئی تو وہ بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا اور چیخ کر بولا۔

"صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے، صرف ایک آدمی"

یہ سن کر ایک پولیس والا جھٹ بس میں سوار ہو گیا اس کی دیکھا دیکھی ایک مسکین سے بڑے میاں بھی چڑھ گئے۔ کنڈیکٹر نے غصے سے کہا۔

"آپ نے سنا نہیں! میں نے کہا ہے صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے۔"

بڑے میاں معصومیت سے بولے: "وہ تو پولیس والا ہے" آدمی تو میں ہوں۔"

اورنگ زیب، ضلع چکوال

کرکٹ کی دنیا میں ایک نیا فاسٹ بولر آیا جو ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک صاحب کچھ دیر بعد اسٹیڈیم آئے انہوں نے برابر والے صاحب سے کہا۔

"کیوں صاحب نیا بولر کیسا ہے؟"

"کم بخت نے آتے ہی تین وکٹ اور دو مریض حاصل کر لیے۔" برابر والے نے جواب دیا۔

عادل احمد صدیقی، شہباز نگر، دستگیر کراچی

ایک سیاسی لیڈر نے ایک رسالے کے ایڈیٹر کو فون کیا اور کہا: میں نے سُنا ہے کہ تم نے مجھے اپنے رسالے میں جاہل اور بے وقوف لکھا ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

"نہیں جناب" ایڈیٹر نے جواب دیا: "یہ بات کسی اور نے اپنے رسالے میں لکھی ہوگی۔ میں وہ بات کبھی اپنے رسالے میں نہیں لکھتا جسے میرے قارئین پہلے سے جانتے ہوں۔"

محمد ادریس قریشی، منڈی بہاؤالدین

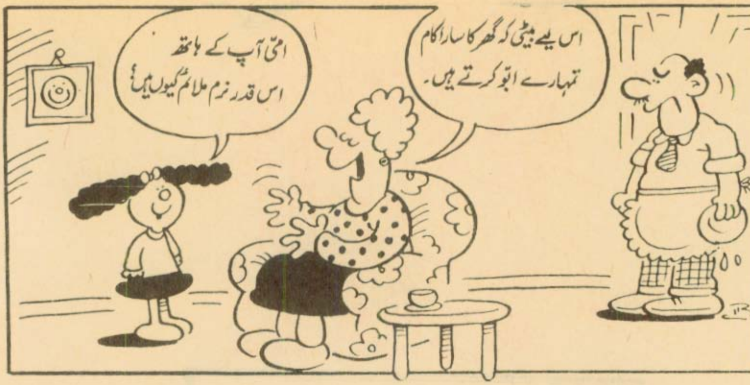


گاہک (دکاندار سے) "کل میں نے آپ کی دکان سے ہاتھی دانت کی کچھ چیزیں خریدی تھیں مگر میں نے گھر جاکر دیکھا تو وہ پلاسٹک کی نکلیں۔"
دکاندار: "دراصل بات یہ ہے جناب کہ ہاتھی نے مصنوعی دانت لگوایا ہوا تھا۔"

فوزیہ رفیق۔ ناظم آباد، کراچی

شوہر (بیوی سے) "حیرت ہے کہ تم نے ٹیلی فون پر صرف بیس منٹ بات کی۔"
بیوی (منہ بناکر) "ظاہر ہے رانگ نمبر پر زیادہ دیر بات نہیں ہو سکتی۔"

فدا حسین ملک رُحمانی نگر

مولانا محمد علی جوہر ایک بار کسی دعوت میں مدعو تھے۔ اُن کے سامنے شریفے لاکر رکھے گئے۔ مولانا شریفے کھانے کے بعد اس کے بیج زمین میں بونے لگے، کسی نے پوچھا "یہ کیا؟"
مولانا نے کہا "بھئی یہاں شریفوں کی کمی ہے، اس لیے بیج بو رہا ہوں۔"

عبدالقدوس قریشی، پنڈ دادنخان

ایک صاحب کے گھر کچھ مہمان آگئے۔ ایک مہمان نے اُن کی بچّی سے پوچھا: "بیٹے! آپ گھر میں کیا کام کرتی ہیں؟"
بچّی نے کہا "میرا کام ابھی شروع نہیں ہُوا۔"
مہمان نے سوال کیا: "آپ کا کام کیا ہے؟"
"آپ لوگوں کے جانے کے بعد چمچے گننا۔" بچّی نے معصومیت سے کہا۔

عطاء المحسن طاہر، پنڈ دادنخان

دروازے پر دستک ہوئی۔ خاتونِ خانہ نے دروازہ کھولا تو اجنبی نے مٹّی سے بھرا ہوا لفافہ سامنے بچھے ہوئے قالین پر اُلٹ دیا۔
"یہ کیا حرکت ہے؟" خاتونِ خانہ چلّائیں۔
"مادام میں ویکیوم کلینر فروخت کرتا ہوں۔ اگر چند لمحوں میں ہماری مشین سے یہ قالین صاف

نہ ہوگیا تو میں اپنی زبان سے چاٹ کر اسے صاف کر دوں گا۔"

"تو پھر شروع ہو جاؤ، ہمارے گھر میں بجلی نہیں ہے۔" خاتونِ خانہ نے جواب دیا۔

کامران سلیم - نارتھ ناظم آباد کراچی

ایک وکیل صاحب اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے بڑے زور و شور سے دلائل دے رہے تھے جب ان کے پاس تمام دلائل ختم ہو گئے تو انھوں نے جج سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جنابِ عالی! قانون کے مطابق اس قسم کے مجرم کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی اس کی کل چار مثالیں ہیں جن میں سے ایک مثال آپ کے سامنے رکھی ہوئی قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۴۰ پر موجود ہے۔" جج صاحب نے کتاب کھولی تو صفحہ نمبر ۱۴۰ پر ایک ایک ہزار کے چار نوٹ رکھے تھے۔ جج صاحب نے کتاب سے نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس قسم کی بقیہ تین مثالیں بھی پیش کی جائیں۔"

محمد اکمل - شاہ فیصل کالونی نمبر ۲، کراچی

دیوار پر کئی اشتہارات اوپر نیچے لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ اس طرح آپس میں مل گئے تھے کہ ایک نئی تحریر وجود میں آگئی تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"خواتین و حضرات! ہمارے جوتے بہترین جوتے۔ ایک ماہ میں آپ کے سر پر بال اُگا سکتے

ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ آج ہی تشریف لائیے
پیشگی بکنگ جاری ہے، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی
ایک نیا انقلاب۔ شرفا کے لیے پردے کا خصوصی
انتظام ہے۔ راز داری ہمارا شیوہ ہے۔"

راحت علی ۔ عارف والہ

دو ہم شکل جڑواں بچے اپنے کمرے میں بیٹھے
ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک ہنسی کے مارے لوٹ
پوٹ ہو رہا تھا جبکہ دوسرا مسلسل رو رہا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا؟" بچوں کے والد نے کمرے میں
داخل ہو کر پوچھا۔
"کچھ نہیں ابو۔" ہنسنے والے بچے نے جواب دیا
"امی نے آج دونوں مرتبہ احمد کو ہی غسل کرا دیا ہے۔"

محمد عظیم ۔ سمن آباد ۔ لاہور

ایک دوست (دوسرے دوست سے) "اگر تمہارا
ایک کان کسی حادثے میں کٹ جائے تو؟"
دوسرا "تو میں ٹھیک سے سُن نہ سکوں گا۔"
پہلا "اگر دونوں کٹ جائیں تو؟"
دوسرا "میں ٹھیک سے دیکھ نہ سکوں گا۔"
پہلا "وہ کس طرح؟"
دوسرا "وہ اس طرح کہ میرا چشمہ گر جائے گا"

ممتاز حبیب ۔ جگہ نامعلوم

جیومیٹری کے استاد (طلبہ سے) "آج ہم آپ کو مربع
بنانا سکھائیں گے۔"
شاگرد "جناب چٹنی بنانا کب سکھائیں گے؟"

ناصر خان ۔ سکھر

ایک حاضر جواب خاوند کی مالی حالت بگڑ گئی تو
ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔
"حالات خراب ہو گئے ہیں یوں کرو کہ بچوں کو
ننھیال بھیج دو اور تم اپنی والدہ کے گھر چلی جاؤ۔ میں بھی
اللہ کے سہارے اپنے سُسرال چلا جاتا ہوں۔"

حسین احمد غفرلہٗ ۔ حیدر آباد

تُم نے ہمیں ہمارے بچپن میں نہیں دیکھا۔ اس کی ایک سیدھی سادی اور بہت عام سی وجہ ہے۔ وہ یہ کہ دُنیا میں تم ہمارے بعد آئے ہو۔ ہم دُنیا بھر کے لالچی ترین چٹورے بچّوں میں سے ایک تھے۔ گندے بھی بہت تھے۔ مٹّی بھی کھا جاتے تھے۔ کیچوؤں کو رہنے کے لیے ہمارا معدہ بہت پسند تھا۔ اُنھیں پتا تھا کہ ہر منٹ پر کوئی نہ کوئی چیز ہمارے حلق سے ضرور نیچے اُترے گی۔ وہ نہ صرف خود رہتے تھے بلکہ دوسرے کیچوؤں کو بھی دعوت دیتے رہتے تھے۔ لہٰذا امّی اکثر ہمیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرتی تھیں۔ ٹافیاں کھا کھا کر ہم نے اپنے دانتوں کا ناس مار لیا تھا۔ ہمارے چٹورپن سے تنگ آکر امّی پاپا نے اپنا فرج الگ کر لیا تھا۔ اور پُرانے فرج کے بجائے لاک والا فرج خرید لیا تھا۔

ہمارے محلّے میں ایک امرُود کا درخت تھا جس کی مالکن بہت ہی خوفناک دانتوں والی بڑی اماں تھیں۔

# جب ہم کھو گئے تھے

بچپن کا ایک یادگار واقعہ جس نے سب گھر والوں کو پریشان کر دیا

رفعت ھمایوں

وہ اُن بچّوں کو خوب مارتی تھیں جو اُن کے گدرائے گدرائے امرُودوں کو توڑا کرتے تھے۔ اور ہم تو اُن سے اکثر پٹتے تھے۔

ہمارے پاپا نے کچھ لوگوں کے وظیفے باندھ رکھے تھے۔ اُن میں سے ایک وہ بڑی اماں بھی تھیں۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ وظیفہ لینے ہر مہینے کی پہلی اتوار کو آیا کرتی تھیں۔ امرُودوں والی اماں صبح نو بجے آیا کرتی تھیں۔ ہم اُن کے آنے سے پہلے مزے سے گیٹ پر جھُولتے رہتے اور جب امرودوں والی اماں آتیں ہم جھُولنا بند کر کے اُنھیں وہیں روک دیتے اور سوالات کر کر کے اُنھیں پریشان کر دیتے۔ پھر کہتے کہ پاپا سو رہے ہیں ( ہمیں اُس

وقت پتا نہیں تھا کہ کسی غریب کو تنگ کرنا کتنے بڑے گناہ کا کام ہے۔ ہم تو اپنے لالچ کے ہاتھوں مجبور تھے۔) بے چاری خوشامد پر اُتر آتیں مگر ہم انہیں اندر ہی نہیں جانے دیتے۔ پھر کہتے اچھا وعدہ کریں کہ آپ ہمیں امرود توڑنے دیں گی۔ ادھر وہ وعدہ کرتیں اُدھر ہم تیر کی طرح اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتے اور پاپا کے پاس جاکر معصوم سا منہ بنا کر کہتے۔ اللہ! پاپا بے چاری کتنی غریب ہیں۔ اُن کا وظیفہ ہمیں دے دیں۔ ہم انھیں جاکر دے آئیں گے۔ پاپا کہتے نہیں وہ خود آکر لے جائیں گی۔ تم کہیں پیسے گرا پڑا دوگی تو ہم فٹ کہتے کہ پاپا وہ کہتی ہیں کہ اُنھیں بڑی شرم آتی ہے۔ آپ ہمیں دے دیں ہم بند کا بند اُنھیں لے جاکر دے دیں گے۔ پھر پاپا ہمیں وظیفے کا لفافہ پکڑا دیتے اور جاکر امرودوں کا پکّا وعدہ لے کر لفافہ اُنھیں تھما دیتے۔

اُن کے جانے کے بعد چُوزوں والی اماں آیا کرتی تھیں۔ وہ ہمیں اپنے چوزوں کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتیں تھیں کہ تم انھیں دبا کر مار دو گی۔ ہم اُن سے وعدہ لیتے کہ آپ ہمیں روزانہ چُوزوں کو ہاتھ لگانے دیں گی۔ جتنی دیر تک ہم چاہیں اُن سے کھیلیں گے اور جب بھی اُن کی مُرغی کے نئے انڈے پھوٹیں گے تو دو مُنّے مُنّے روئی کے چوزے ہمیں دیں گی۔ ہم اُن سے پکّا وعدہ کرتے کہ جب اُن کے چوزوں کے پَر نکلیں گے اور وہ ہمیں بُرے لگنے لگیں گے تو ہم اُنھیں واپس کر دیں گے۔ وہ بھی وعدہ کرتیں اور پھر انھیں بھی پاپا کے سامنے جانے سے شرم آنے لگتی... ہم انھیں بھی پاپا کے سامنے نہ جانے دیتے تھے کہ کہیں وہ ہمارا بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔

ایک مزے کی بات تمہیں اور بتائیں۔ ہماری شکل پر ایسا بھولپن ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ ہم اتنے گنُوں کے پُورے ہیں۔ ہم اکثر اسٹور میں جاکر انناس کے ٹن میں سوراخ کرکے اُس کا سارا جُوس پی جایا کرتے تھے۔ اور جب انناس کا ٹن کُھلتا تو بے چارے انناس کے قتلے سوکھا سا منہ بنائے پڑے ہوتے۔ پھر اُس چالاک چور کی ڈھنڈیا پڑتی جو کہ اتنی ہوشیاری سے ایسا باریک سوراخ بنا کر سارا جُوس پی گیا۔ ہم بھی بہت شور مچا مچا کر اُس چور کو ڈھونڈتے کہ جُوس کس نے پیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لالچی چور پاس کھڑا ہے۔ سارا شُبہ نوکروں پر جاتا تھا (اللہ میاں ہمیں معاف کرے) کہ اتنے چالاک وہی ہو سکتے ہیں۔

ہاں تو ہم بتا رہے تھے کہ ہم بہت آرام سے اور بڑی جلدی کھو جایا کرتے تھے اور اس کی وجہ صرف اور صرف ہمارا لالچ تھا۔ کوئی بھی کہیں کھانے کی چھوٹی سی چیز بھی دکھاتا ہم کچھ سوچے سمجھے بغیر اُس چیز کی لالچ میں آکر اُس کے پیچھے چل پڑتے۔ کھوئے تو ہم کئی بار ہیں مگر قسمت سے ہمیشہ واپس مل گئے۔ ہم تمہیں سب سے پہلی دفعہ کا واقعہ سُناتے ہیں۔ ہُوا یُوں کہ...

... ہمارے چھوٹے چچا میاں فلم دیکھ کر واپس آرہے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک بچّی کو سائیکل کے کیریئر میں ڈالے لے جارہا ہے۔ وہ بچّی بُری طرح رو رہی تھی۔ اُس کی آواز سُن کر چچا میاں کو یوں لگا کہ جیسے یہ آواز انہوں نے سُنی ہوئی ہے۔ وہ ذرا قریب آئے تو اُس بچّی کی فراک کا کونا اور اُس کا ہاتھ دکھائی دیا جس میں مٹھائی دبی ہوئی تھی۔ وہ فراک چچا میاں اچھّی طرح پہچانتے تھے۔ وہ فوراً لپکے اور سائیکل والے کے پاس آئے۔ سائیکل کے کیریئر میں ہم ٹھُنسے ہوئے تھے۔ عجیب طرح کی گٹھڑی سا بنا کر اُس نے ہمیں اُس میں ڈال دیا تھا۔ چچا میاں نے پوچھا "تم کس طرح بچّی کو لے جارہے ہو۔ اس کا سانس گھُٹ رہا ہے اور تمہیں اس کی فکر نہیں"۔ وہ آدمی غصّے سے بولا۔ "جاؤ جاؤ اپنا کام کرو، میری بچّی ہے میں جیسے بھی لے کر جاؤں"۔ چچا میاں نے کہا "تمہاری بچّی"؟ اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ اُس آدمی پر پل پڑے اور ساتھ ہی شور مچا دیا وہ ہمیں پہچان چکے تھے۔ کیونکہ چچا میاں کی آواز سُن کر ہم نے اپنا منہ اُوپر کیا اور "تامیاں، تامیاں" چلّانے لگے۔ وہ آدمی گھبرا کر بھاگا۔ لوگ بھی اُس کے پیچھے بھاگے۔ چچا میاں بھی ہمیں بھُول کر اُس کی طرف لپکے مگر پھر فوراً ہمارا خیال آگیا۔ واپس پلٹ کر ہماری طرف آئے۔ ہم جو سائیکل کے کیریئر میں بُری طرح ٹھُنسے ہوئے تھے باہر نکالا اور خُوب پیار کیا۔ جب ہم گھر آئے تو وہاں سب حیران پریشان ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ چچا میاں کی گود میں دیکھ کر سب لپکے اور چچا میاں کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ "میاں کم از کم ہمیں بتا کر تو جایا کرو"، خیر بڑی مشکل سے انھوں نے سب کو چُپ کرایا اور پورا واقعہ سُنایا۔

سب لوگ ہمارے لالچ سے پریشان ہو گئے اور پھر اُس دن کے بعد سے ہمارا خاص خیال رکھا جانے لگا تاکہ ہمارا لالچ نہ بڑھنے پائے۔ جب ہم ذرا سے بڑے ہوئے تو پاپا نے ہمیں سمجھایا کہ لالچ کتنی بُری بَلا ہے اور یہ کہ یا تو یہ لالچی بچّے، بڑے ہو کر لالچی لوگ بن جاتے ہیں جو ذرا سی دولت کی خاطر ہر بات کا سودا کرنے لگتے ہیں۔ اُن کا لالچ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر سب کچھ بیچ ڈالتے ہیں۔ اپنا وقار، اپنی عزّت یہاں تک کہ اپنا وطن بھی یا یہ ہی بچّے خراب اور لالچی لوگوں کے ہتھّے چڑھ جاتے ہیں۔ جو بچّوں کو اغوا کر کے اُن کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اُن سے بھیک منگواتے ہیں۔ اور اُن بچّوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ہم نے پاپا سے پکّا وعدہ کیا کہ ہم آئندہ کبھی بھی لالچ نہیں کریں گے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہم دوبارہ کھو گئے ... وہ کیسے ...؟ وہ ایسے کہ ... یہ ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے۔

# بدنصیب

مجیب ظفر انوار

"کالے خان" "کالی بھیڑ" "بلیک آؤٹ" یہ سارے میرے نام تھے کیونکہ میرا رنگ بہت کالا تھا۔ میں کالا اب بھی ہوں مگر اب یہ میرے نام نہیں ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے لیکن جب آپ میری کہانی پڑھ لیں گے تو حیران نہیں ہوں گے۔

ہُوا یوں کہ جب میں پیدا ہُوا تو نانی جان کا انتقال ہوگیا اور سونے پر سہاگہ کہ میری رنگت اُلٹے توے کی مانند سیاہ تھی۔ اس قسم کے پے درپے حادثات نے مجھے "منحوس" ثابت کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں میں گھر والوں کی محبّت سے محروم ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ والدین کا پیار کیسے کہتے ہیں اور بڑے بہن بھائیوں کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ جب اسکول میں داخلہ ہُوا تو وہاں بھی ہم جماعتوں نے میرا نام "کالا ہاتھی" رکھ دیا۔ یُوں میرے نت نئے نام پڑتے چلے گئے اور ایک صرف رنگ ہی کیا' ہر بات کا مذاق اُڑایا جاتا۔

میرے جسم پر ہزار روپے کا سوٹ بھی بھائی جان کو ٹکے کا لگتا۔ میرے پیروں میں لاکھ روپے کی جُوتی بھی کوڑی کی لگتی۔ اور میری کلائی میں قیمتی سے قیمتی گھڑی بھی معمولی دکھائی دیتی۔

دن یُوں ہی گزُرتے رہے۔ میں اب میٹرک میں آگیا۔ جسمانی طور پر بھی میں کمزور ہی تھا۔ سیاہ رنگت دُبلے پتلے بازو، سُوکھا سڑا جسم۔ مجھے خود کو دیکھ کر اُبکائی آتی تھی۔ مگر میں نے اپنے بنانے والے سے کبھی شکوہ نہیں کیا۔

ایک دن چند خوش پوش خواتین ہمارے گھر آئیں اور دیر تک امی جان سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہیں۔ بعد میں مجھے نصیبن بُوا نے بتایا کہ وہ عورتیں بجیا کا پیغام لے کر آئی تھیں۔ بجیا نے ان دنوں بی۔ ایس۔ سی پاس کیا تھا اور فارغ تھیں۔ نصیبن بُوا ہمارے گھر کام کیا کرتی تھیں۔ بے چاری بہت ضعیف تھیں، ان کے سپرُد صرف باورچی خانہ تھا اور ایک لڑکا شہباز خان گھر کے چھوٹے موٹے اندر باہر کے کام نمٹاتا تھا۔ نصیبن بُوا نے جب مجھے بجیا کی شادی کا بتایا تو خوشی کے مارے میرے پیر زمین سے نہ لگ رہے تھے۔ میں بھاگا بھاگا اپنے کمرے میں آیا اور دھپ سے بستر پر گر پڑا۔ "اُف۔۔۔ بجیا دلہن بن کر کتنی اچھی لگیں گی!" میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ "کتنا مزہ آئے گا۔"

وہ عورتیں دو تین بار اور آئیں۔ ابّو اور امّی نے لڑکے کے بارے میں حتمی تحقیق کر کے رشتے کی ہامی بھرلی۔ اب تو جیسے ہمارے گھر میں بہار آگئی۔ مگر اچانک ہی ہمیں ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان ہی دنوں سردیوں کی وجہ سے نصیبن بُوا پر فالج کا شدید حملہ ہُوا اور وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔

نصیبن بُوا کا اس دنیا میں ہمارے گھرانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا ان کے سوگ میں شادی کی تاریخ آگے بڑھا دی گئی۔ شادی کے کارڈ چھپ کر آچکے تھے اور اب ان پر نام لکھنے کا سلسلہ جاری تھا۔ بوا نصیبن کی موت سے جو سناٹا پیدا ہوا تھا ختم ہو گیا تھا اور پھر وہی چہکاریں۔ سچ ہے! کون کسے یاد رکھتا ہے؟ مُردے کو یاد کرتے ہیں تو برسی ہوتی ہے اور زندہ کو یاد کرلیں تو سالگرہ۔

بجیا کی شادی کی خوشی میں تقریباً پورا خاندان ہی ہمارے گھر میں براجمان ہو گیا تھا۔ روز شام سے رات گئے تک ڈھولک پر گیت ہوتے، لڑکے لطیفے، چٹکلے سُناتے، گیت گاتے۔

میں اپنے کمرے میں چھپا ان تماشوں سے لُطف اندوز ہوتا رہتا یا پھر اپنے میٹرک کے امتحانات کی تیّاری کرتا رہتا۔ مجھے کتابوں میں بڑا سکون ملتا تھا۔ ایک عجیب سی دُنیا محسوس ہوتی۔ اُس دنیا میں مجھے کوئی نیا نام نہ دیتا تھا بلکہ میرا نام وہی ہوتا جو کتاب کے اُوپر لکھا ہوتا، میرا اصلی نام ——

انہی دنوں ایک افسوسناک واقعہ اور پیش آیا۔ بھائی جان کی پتلون کی جیب سے کسی نے دس ہزار روپے

اُڑالیے ۔ رقم بجیا کے جہیز کا سامان خریدنے کے لیے اُنہیں ابا جان نے دی تھی ۔ پھر پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی ۔ پولیس نے تفتیش کے دوران نصیبن کے لڑکے شہباز کو گرفتار کر لیا جو ہمارے ہاں ملازم تھا ۔ رقم برآمد ہو گئی لیکن اکلوتے نوکر سے بھی گھر والے محروم ہو گئے ۔ شادی کے گھر کے کاموں کے لیے ایک عدد نوکر کی سخت ضرورت تھی ۔ نوکر کی تلاش شروع ہو گئی ۔ یہاں تک کہ مہندی کا دن آ پہنچا ۔ سب کو نوکر کی فکر کھائے جا رہی تھی " میرے تو ہاتھ چھِل گئے ہیں کام کر کر کے ۔" بھائی جان بولے ۔

" میرے ناخن ٹوٹ چکے ہیں برتن دھو دھو کے ۔" باجی بولیں ۔

" تو نوکر جلدی رکھو نا ۔" ہمایوں بیٹھی بجیا نے رائے دی ۔ اس پر سب نے گھور کر اُنہیں دیکھا " تم تو مایوں بیٹھی ہو ، پکی پکائی مل جاتی ہے دونوں وقت ، تمہیں کیا پتا نوکروں کے پیچھے بھاگنا عالمی کپ جیتنے کے برابر ہے ۔" بھیا جل کر بولے ۔ بجیا چُپ ہو گئیں ۔ میں دن بھر اپنے کمرے میں مقید رہتا ۔ دل تو چاہتا کہ ان ہنگاموں میں شریک ہو جاؤں مگر ہمت نہ پڑتی ۔ گھر والوں نے بھی کبھی بُلانے اور یاد کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ...

مہندی والے دن امی بولائی بولائی گھر بھر میں پھر رہی تھیں ۔ باجی کے چہرے کا رنگ الگ فق تھا " امی ! کیا میں آج بھی برتن دھوؤں گی ؟" باجی نے روہانسے لہجے میں پوچھا " نہ نہ میری بچی ... ہمایوں بتا رہا تھا کہ اس کے دوست کے ہاں کوئی لڑکا ہے وہ آج آ کر کام وغیرہ کر دے گا ۔ مگر میں فکرمند ہوں کہ وہ لڑکا ابھی تک آیا کیوں نہیں ! اب تو خاص مہمان بھی آنے والے ہیں ۔ سارے کام ادھورے پڑے ہیں ۔" امی جان نے کہا ۔ نوکر کی آمد کا سُن کر باجی کے چہرے پر بہار کے رنگ بکھر گئے ۔

مہندی کی تقریب سے کچھ گھنٹے پہلے میں نے اپنا ایک بے حد پُرانا سوٹ نصیبن بُوا کا بھورا بوسیدہ دوپٹہ اور شہباز کے جوتے لے کر اپنے ایک دوست کے گھر پہنچا ۔ میرا یہ دوست قریب ہی رہتا تھا ۔ شاہد کے گھر پہنچ کر میں نے اُسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا ۔ اسے میرے گھریلو حالات کا علم تھا ۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور ساتھ لایا ہوا لباس پہن لیا ۔ اب میری جگہ ایک کام کاج کرنے والا مفلوک الحال لڑکا تھا ۔ شاہد میک اپ کا بڑا ماہر تھا ۔ اسکول کے اسٹیج ڈراموں میں اداکاروں کے میک اپ وہی کیا کرتا ۔ وہ اپنے فن میں ایسا طاق تھا کہ نقل کو اصل بنا دیتا " یار تم تو پہچانے نہیں جا رہے ۔" شاہد نے میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا " ہاں یہ تمہارا ہی کمال ہے کاش تم حُلیے کے ساتھ ساتھ میری رنگت بھی بدل دیتے ۔" میں نے مذاقاً کہا ۔ اندھیرا ذرا گہرا ہُوا تو میں شاہد سے رخصت ہو کر گھر کی طرف چل پڑا ۔ وہاں تو جیسے میری حیثیت وی آئی پی کی سی ہو گئی ۔ سب سمجھے کہ وہی نوکر آ گیا جس کا وہ صبح سے انتظار کر رہے تھے ۔ بھائی

جان، بھیّا، باجی، ابّو اور امّی نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور امّی اور باجی نے مجھے باورچی خانے میں بھیج دیا۔

شاہد کے کمالِ فن کی وجہ سے کوئی مجھے پہچان ہی نہ سکا اور پھر میرے گھر والوں نے مجھے غور سے نگاہ بھر کر دیکھا ہی کب تھا! میں نے برتن دھونے شروع کیے۔ نصیبن بُوا کے دوپٹے کی پگڑی مجھ پر عجیب سی لگ رہی تھی۔ آدھا چہرہ پگڑی میں چھپا تھا۔ اور پھر موٹے موٹے سوئیٹرز نے مجھے فربہ بنا رکھا تھا۔ میں نے بڑی دِل جمعی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ نجانے مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت کہاں سے آگئی تھی۔ شاید یہ بھیا کی شادی کا معاملہ تھا جس نے مجھ میں اتنا ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا۔ میں اندر کمرے میں بھی گیا۔ بھیا پیلے کپڑوں میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

وہ ہنگامے ہوئے کہ تو بہ... شور ہی شور۔ مووی کی چُندھیا دینے والی لائٹ اور کیمروں کی چمک۔ گیت اور قہقہے اور پھولوں کی مہک۔ ریشمی قیمتی لباسوں کی سرسراہٹ۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اپنے کمرے کی لائٹ جلا دی تھی تاکہ گھر والے سمجھیں کہ میں کمرے میں ہوں۔

پوری تقریب گزر گئی مگر کوئی بھی میرے کمرے کے قریب نہ پھٹکا۔ تھکن سے میرا جسم چُور چُور ہو رہا تھا۔ انگ انگ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ جب کام ختم ہو گیا اور تمام مہمان چلے گئے تو میں نے امّی سے اجازت چاہی۔

"بیٹا تمہارا بہت بہت شکریہ... تم نے بروقت ہماری مدد کی۔ یہ لو یہ رکھ لو۔" امّی نے شاید پہلی مرتبہ مجھے بیٹا کہا اور ساتھ ہی چند نوٹ مجھے پکڑا دیے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور پچھلے دروازے سے نکل کر چپکے سے پائیں باغ میں آیا اور دیوار پھاند کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میری گردن پکڑ لی "چور چور... پکڑو چور" بھائی جان کی چیخیں اُبھریں۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میری گردن پر تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گھر کے بچے کھچے مہمان اور گھر والے میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اچانک ابّو کی نظر میرے پیروں پر پڑی۔ شہباز کے جُوتے میرے پیروں میں تھے۔

"شہباز خان... ارے پکڑو۔ یہ پھر بھیس بدل کر آیا ہے، مارو اسے" ابّو کا اتنا کہنا تھا کہ بھیا اور بھائی جان مجھ پر پل پڑے۔ ایک تو تھکن کے مارے میری حالت ویسے ہی غیر تھی۔ بھیا کے کرارے تھپڑوں نے میری پگڑی دُور اُچھال دی اور جب میرا اصل چہرہ میرے گھر والوں کے سامنے آیا تو جیسے اُن سب کو سانپ سونگھ گیا۔

میں فرش پر گر پڑا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل میں نے صرف امّی کی آواز سُنی جو روتے ہوئے کہہ رہی تھیں "میرا بچہ... میرا لعل"

سیّد نظر زیدی

# بہن کی دُعا

ریل گاڑی کے مُوجد کے بچپن کے یادگار واقعات

اب سے کوئی سوا سو برس پہلے کی بات ہے۔ برطانیہ کے علاقے نیوکیسل کے ایک گاؤں ویلام میں میلہ لگا۔ کھیل تماشے دکھانے والوں نے اپنے اپنے ڈیرے خیمے لگائے۔ سوداگروں نے اپنی اپنی دکانیں سجائیں۔ اور میلہ دیکھنے کے شوقین سج بن کر اور ٹولیاں بنا کر آنے لگے۔

میلہ دیکھنے والوں کی اسی بھیڑ میں دو بہن بھائی بھی تھے۔ بھائی گیارہ بارہ برس کا ہوگا اور بہن اُس سے دو ڈھائی برس چھوٹی۔ یہ دونوں اسی گاؤں کے ایک مزدور کے بچے تھے جو کوئلے کی ایک کان میں کام کرتا تھا۔

یہ دونوں بچے رنگ رنگ کے سامان سے سجی ہوئی دکانوں کے سامنے ذرا دیر رُکتے، رنگین کھلونوں اور دوسرے سامان کو غور سے دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ انہوں نے میلے کی قریب قریب سبھی دکانوں کا سامان دیکھا، لیکن خریدا کچھ بھی نہیں، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی جیبوں میں پھُوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

اسی طرح گھُومتے ہوئے وہ کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے پہنچے تو لڑکی نے ایک ہاتھ بڑھا کر ایک گُڑیا اُٹھالی اور اُسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اس کی خوبصورتی اپنی آنکھوں میں بھر لے گی۔

لڑکے نے اپنی بہن کو گڑیا کی طرف یُوں دیکھتے ہوئے دیکھا تو پیار بھری آواز میں بولا۔

"کیا یہ گڑیا تمہیں بہت اچھی لگی ؟"

"ہاں بہت اچھی ۔ کاش ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے اور میں اُسے خرید سکتی" لڑکی نے اُداس ہو کر کہا ۔

اپنی بہن کی یہ بات سُن کر لڑکا کچھ دیر سوچتا رہا ۔ اُس کے چہرے پر بھی اُداسی چھا گئی تھی ۔ اِس بات سے اُسے بہت رنج ہوا تھا کہ اس کی بہن کو گڑیا پسند آئی ہے اور اُسے خرید نہیں سکتے ۔

دکاندار بھی اُن بچّوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا ۔ اس کا خیال تھا بچّے گڑیا کی قیمت پوچھیں گے اور اُسے نفع کے کچھ پیسے مل جائیں گے ، لیکن جب بچّوں نے قیمت نہ پوچھی تو ناراض ہو کر بولا ۔

"جیب خالی ہے تو چیزوں کو ہاتھ لگانے کی کیا ضرورت ہے ۔ رکھ دو گڑیا کو اُس کی جگہ !" لڑکے کو دکاندار کی یہ بات بہت بُری لگی ، لیکن چونکہ بات سچّی تھی کچھ نہ کہہ سکا ۔ اپنی بہن کی طرف دیکھ کر بولا ۔

"بے بی گڑیا اُس کی جگہ رکھ دو اور ذرا دیر یہیں ٹھہرو ، میں کوشش کرتا ہوں کچھ پیسے مل جائیں ۔ کامیاب ہو گیا تو یہ گڑیا خرید لیں گے اور اپنے ساتھ گھر لے جائیں گے ۔"

"لیکن پیسے ملیں گے کہاں سے ۔ امّی جان کے پاس تو کچھ بھی نہیں" لڑکی اور بھی اُداس ہو گئی ۔

مجھے معلوم ہے " لڑکے نے کہا " میں اپنے طور پر کوشش کروں گا ۔ تم دعا کرو اللہ پاک کامیابی دے ۔" لڑکے نے کہا اور یہ کہتا ہوا ایک طرف چل دیا " دیکھو میرے آنے تک تم یہیں رہنا !"

---

اپنی بہن سے جُدا ہو کر لڑکا میلے کے اُس حصّے میں آ گیا ۔ جہاں ضرورت کی عام چیزوں کی دکانیں تھیں اور گاہکوں کی کافی بھیڑ تھی ۔ گاہک جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے ۔ لڑکا ایک بہت موٹی خاتون کے پاس رُک گیا جس نے اچھا خاصا بھاری تھیلا اُٹھا رکھا تھا ۔ لڑکے نے اُس کے پاس رُک کر بہت ادب سے کہا ۔"امّی جان ، اگر آپ پسند کریں تو آپ کا یہ سامان میں آپ کے گھر پہنچا دوں ۔ یقین کیجیے میں زیادہ مزدوری لینے کی ضد نہ کروں گا ۔ آپ جو دیں گی خوشی سے لے لوں گا ۔"

خاتون نے بہت خوش ہو کر لڑکے کی طرف دیکھا اور اپنے تھیلے کو کندھے سے اُتارتے ہوئے بولی ۔

" شاباش بیٹے شاباش ۔ شریف ماں باپ کے بیٹے لگتے ہو ۔ لو یہ تھیلا اور میرے ساتھ چلو ۔ میں تمہاری امید سے بڑھ کر مزدوری دوں گی ۔ مجھے تم جیسے محنتی اور نیک بچّے بہت پسند ہیں ۔"

لڑکے نے بہت پُھرتی سے سامان کا تھیلا اُٹھا لیا اور خاتون کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خاتون کا گھر زیادہ دُور نہ تھا۔ لڑکے نے ذرا دیر میں سامان کا تھیلا اُس کے دروازے پر جا رکھا اور جب لوٹا تو اُس کی مُٹھی میں اتنے پیسے تھے کہ گڑیا خرید سکتا تھا۔

مزدوری کے پیسے مُٹھی میں دبائے وہ بھاگتا ہوا اپنی پیاری بہن کے پاس پہنچ گیا اور رعب بھری آواز میں دکاندار سے کہا۔"ہاں بھئی اب بتاؤ اس گڑیا کی قیمت کیا ہے؟ لیکن دیکھو جھوٹ ووٹ مت بولنا، بالکل ٹھیک قیمت بتانا۔ میں کم عمر ضرور ہوں، لیکن دھوکے میں نہیں آسکتا۔"

دکاندار نے لڑکے کی بات سُنی تو مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کم عمر بچّے نے اپنی بہن کی خوشی کے لیے کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور اُٹھائی ہے اور اُسے یہ بات بہت اچھی لگی تھی۔ اُس نے گڑیا کی قیمت دو چار پینس کم ہی بتائی اور لڑکے نے فوراً قیمت ادا کر کے گڑیا اپنی بہن کو دے دی۔

گڑیا پاکر لڑکی کا چہرہ پھُول کی طرح کھل گیا۔ اُس نے بہت محبّت سے اپنے بہادر بھائی کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں اپنے گھر آگئے۔

بچّو! یہ کوئی خیالی کہانی نہیں ہے بلکہ سچّا واقعہ ہے۔ جس بچّے نے اپنی پیاری بہن کی خوشی کے لیے یہ تکلیف اُٹھائی تھی اُس کا نام جارج اسٹیفنسن ہے اور یہ وہی جارج اسٹیفنسن ہے جس نے بھاپ کی طاقت سے چلنے والا ریل گاڑی کا انجن بنایا تھا۔

جارج کا باپ ایک غریب آدمی تھا۔ اُس کی غُربت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس نے اپنے اس ہونہار بیٹے کو اسکول بھیجنے کے بجائے کوئلے کی کان میں مزدوری پر لگا دیا تھا۔ وہ سارا دن بڑھیا اور گھٹیا قسم کے کوئلوں کے ڈلے الگ الگ کرتا رہتا تھا۔ اور جب گھر لوٹتا تھا بُری طرح تھکا ہوا ہوتا۔ نہ اُسے کھیلنے کُودنے کا وقت ملتا تھا، نہ کسی تفریح کا۔ پھر بھی وہ بہت خوش رہتا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر ہی میں وہ بڑوں کی طرح یہ سوچا کرتا تھا کہ ہمارے گھر کی ضرورتیں بہت مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔ امّی اور ابّو دن رات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے ایک دن اُسے خیال آیا کہ اتنی محنت کرنے کے باوجود میرے ابّو کی تنخواہ اس لیے کم ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ پھر یہی بات اُس نے اپنے بارے میں سوچی کہ میری

مزدوری بھی اسی لیے کم ہے کہ میں جاہل ہوں، اگر تھوڑی سی تعلیم بھی حاصل کر لیتا تو کوئی اچھی نوکری مل جاتی، یوں کوئلوں کے ڈلے الگ نہ کیا کرتا۔

یہ سب باتیں سوچتے سوچتے آخر ایک دن جارج نے پکّا ارادہ کر لیا کہ میں تعلیم حاصل کروں گا۔ جب اُس نے یہ فیصلہ کیا اُس کی عمر اُنّیس برس ہو چکی تھی۔ اور یہ وہ عمر تھی کہ وہ غریب لڑکے بھی اسکول چھوڑ دیتے ہیں جن کے ماں باپ اسکولوں میں داخل کراتے ہیں۔ لیکن جارج اپنے ارادے پر جم گیا اور تعلیم حاصل کرنے لگا۔ باپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے بھی اپنے پیارے بیٹے کی مدد کی۔ اور اس اچھی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ دو تین سال ہی میں وہ بڑے بڑے مصنّفوں کی کتابیں پڑھنے اور اُن کا مطلب سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

اب جارج کے دماغ میں ایک اور دھن سمائی۔ وہ سوچنے لگا بھاپ کی طاقت سے چلنے والا ایسا انجن بنانا چاہیے جو بھاری سامان سے لدی ہوئی گاڑیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکے۔ اور غریب کے باوجود ایسا انجن بنانے کی کوشش میں لگ گیا۔

جارج اسٹیفنسن سے پہلے کچھ لوگ ایسا انجن بنانے کی کوشش کر چکے تھے۔ اور یہ طریقہ بھی معلوم کر لیا گیا تھا کہ لوہے کی پٹری بچھادی جائے تو اس پر بھاری سے بھاری گاڑی خوب تیز چلائی جا سکتی تھی، لیکن ابھی کوئی ایسا طاقت ور انجن بنانے اور لوہے کی پٹری پر بھاری بوجھ سے لدی ہوئی گاڑی دوڑانے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ سامنے آئی تھی کہ لوہے کی پٹری سے گاڑی کے پہیّے اُتر جاتے تھے۔

جارج اسٹیفنسن نے سوچ سوچ کر اس خرابی کو دُور کر دیا۔ اُس نے ایسے پہیّے بنائے جو پٹری سے نہ اُترتے تھے۔ دوسری طرف وہ ایسا انجن بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا جو بھاری بوجھ سے لدی ہوئی گاڑیوں کو کھینچتا ہُوا کافی تیزی سے لوہے کی پٹری پر دوڑتا تھا۔

کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے میں جارج کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں آئیں، لیکن وہ دھن کا ایسا پکّا تھا کہ برابر اپنے کام میں لگا رہا اور آخر وہ دن آ گیا جب حکومت نے اُسے ریل گاڑی چلانے کی اجازت دے دی اور لوگوں کو بھی یقین آ گیا کہ اس کی بنائی ہوئی ریل گاڑی سے انھیں بہت فائدہ پہنچے گا۔ وہ بالکل آسانی سے بھاری سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکیں گے۔ اور سفر کرنے میں بھی بہت آسانی حاصل ہو جائے گی۔ جو راستہ ہفتوں میں طے ہوتا ہے، دنوں اور

گھنٹوں میں طے ہوجایا کرے گا۔

حکومت کے منظور کئے ہوئے راستے پر جارج نے ۱۸۲۵ء میں پہلی بار ایسی ریل گاڑی چلائی۔ جس کے ڈبوں میں سامان بھی بھرا ہوا تھا۔ اور مسافر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس گاڑی کے انجن کو وہ خود چلا رہا تھا۔

اس کامیابی سے پوری دنیا میں اُس کے نام کی شہرت پھیل گئی۔ اور وہ بہت امیر ہو گیا۔ اگرچہ اُس کی زندگی کے حالات میں یہ بات کسی نے نہیں لکھی، زیادہ تر اُس کی محنت اور قابلیت ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسی شاندار کامیابی اُسے اُس کی اُس نیکی کی وجہ سے ہوئی جو اُس نے اپنی بہن کے ساتھ کی تھی۔

اصل بات یہ ہے بچو کہ قابلیت اور محنت کرنے کی ہمت انسان کو اللہ پاک کی طرف ہی سے ملتی ہے اور ایسے لوگوں کو وہ یہ خوبیاں ضرور دیتا ہے جو نیک دل ہوتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے ـــــــــ

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ادارہ آنکھ مچولی

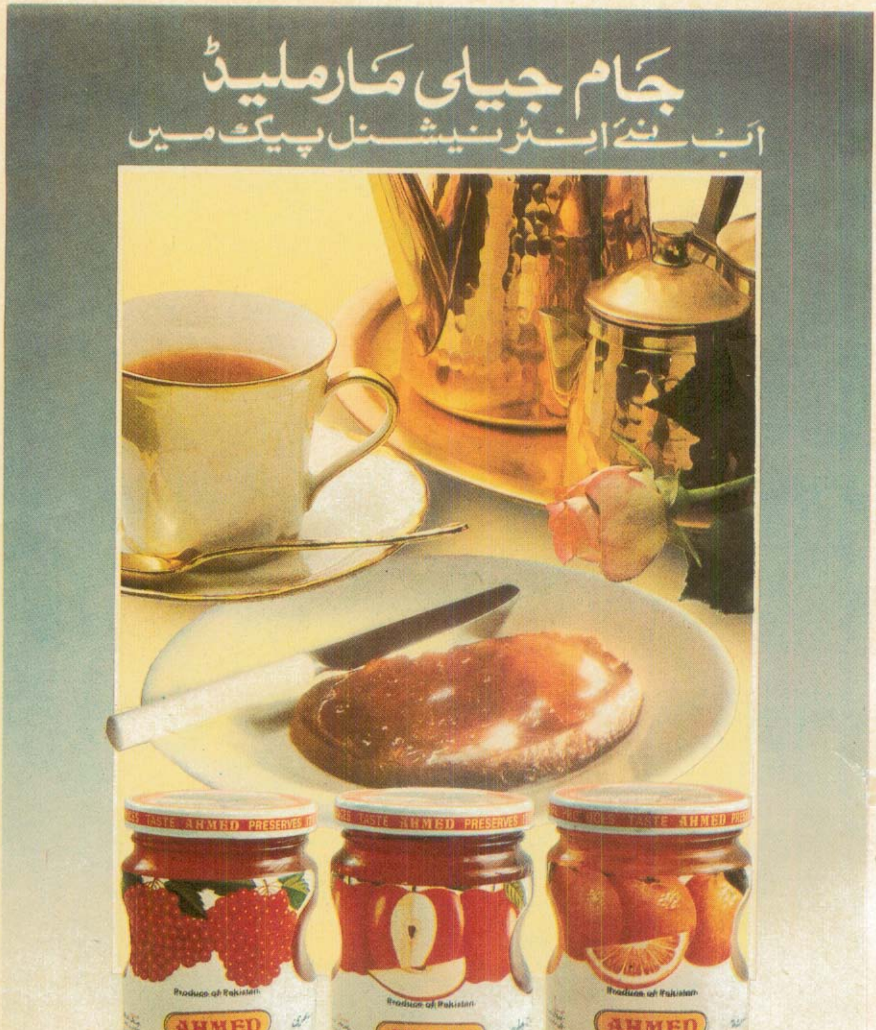

جام جیلی مارملیڈ
اب نئے انٹرنیشنل پیک میں
AHMED PRESERVES
Produce of Pakistan
AHMED
RASPBERRY JAM
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD
Produce of Pakistan
AHMED
APPLE JELLY
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD
Produce of Pakistan
AHMED
ORANGE MARMALADE
AHMED FOOD INDUSTRIES (PVT) LTD
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

# عزم آہن ہو تو مشکل نہیں رہتی مشکل

## ایک ایسی مہم جہاں موت کو بھی پسینہ آجائے

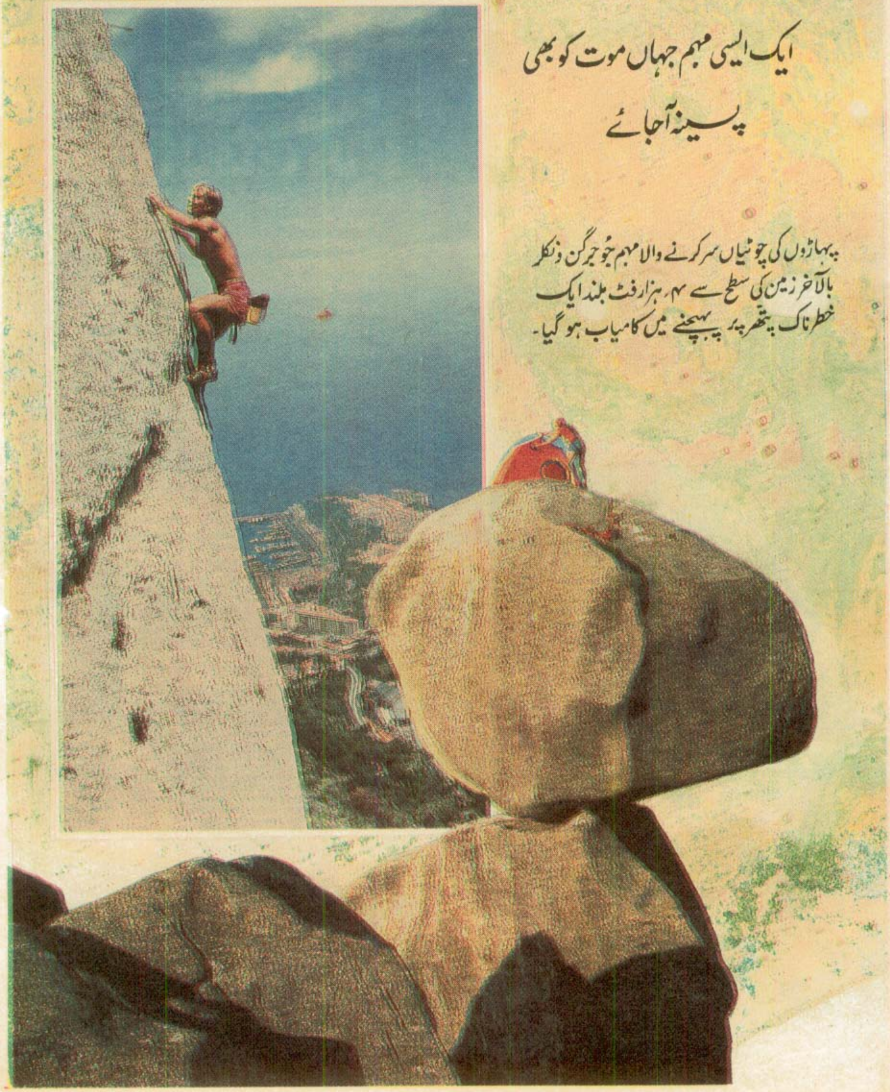

یہ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے والا مہم جُو جیرگن ذنکلر بالآخر زمین کی سطح سے ۴، ہزار فٹ بلند ایک خطرناک پتھر پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

# پہاڑوں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

سعدیہ جمیل

علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ان کا مقصد ستاروں سے مراد سچ مچ کے ستارے نہیں تھا بلکہ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ بلند حوصلہ نوجوان، باہمّت اور بلند عزائم نوجوان انہیں اچھے لگتے ہیں ... بلکہ ایسے حوصلہ مند تو کسے اچھے نہیں لگتے؟

ہم یہاں آپ کو ایسے ہی مہم جُو اور حوصلہ مند نوجوانوں کی بابت کچھ بتا رہے ہیں۔ جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی مشکل راہوں کو عبور کرتے ہیں مشکلات سے نہیں گھبراتے اور ہر خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں ... آپ تصاویر دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ نوجوان کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کی مشکل ترین چوٹیاں عبور کرنے کے کھیل یا فن کو انگریزی میں CLIMBING کہتے ہیں اور یہ فن اتنا آسان نہیں جتنا ہم گھر بیٹھ کر سمجھ لیتے ہیں۔

جب سے ہمالیہ کی چوٹی کسی باہمّت نے سر کی ہے ... لوگوں میں چوٹیاں عبور کرنے کا شوق اتنا بڑھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یورپ اور امریکہ میں اس فن کو سمجھنے جاننے اور سیکھنے کے باقاعدہ کلب کھلنے لگے اور اب تو یہ کلب بھی لاتعداد ہو گئے ہیں۔ اس فن کے دیوانے مغربی ممالک یا لاطینی امریکہ میں سب سے زیادہ ہیں اور ہمارے خطّے میں اس کھیل کے کلب بھارت، جاپان، چین وغیرہ میں بھی قائم ہو گئے ہیں اس وقت دنیا کا سب سے مشہور کلب "الپائن کلب آف لندن" ہے۔ پہاڑوں کی مہم اور اُن کی چوٹیاں سَر کرنا ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ آئندہ کسی موقعے پر اس موضوع سے انصاف کرنے اور آپ کو بھرپور معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ فی الحال تو ہم آپ کی معلومات کے لیے یہ چند باتیں آپ کو بتا دیں کہ

دنیا میں سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں سلسلۂ ایلپس کی مشکل ترین چوٹی کو ایڈورڈ ڈیمپر اور اُس کے ساتھیوں نے سر کیا۔ اس پہاڑ کا نام "میٹرہارن" تھا۔ اور اس کی بلندی چودہ ہزار سات سو ایک فٹ تھی۔ پھر اس کے بعد یورپ کی مشکل ترین چوٹی جو ماؤنٹ ایلبرس پر واقع ہے اُسے ۱۸۶۸ء میں سر کیا گیا۔ اس کی بلندی اٹھارہ ہزار چار سو اکیاسی فٹ ہے۔ ۱۸۸۹ء میں افریقہ کی مشکل چوٹی کلمنجارو اور ۱۹۱۳ء میں امریکہ (الاسکا) کی مشکل ترین چوٹیوں کو سر کیا گیا۔ دنیا کی سب سے بڑی چوٹی جو کوہِ ہمالیہ کے

سلسلے کی ہے۔ اُسے ۱۹۵۳ء میں سر کیا گیا اور اس
کی بلندی تقریباً ۲۹ ہزار فٹ ہے۔

پہاڑوں کی چوٹیوں کا رُخ کرنے کے لیے ابتدا میں
تو صرف تین چیزیں چاہیے ہوتی ہیں نمبر(۱) پہاڑوں سے
بھی بڑا حوصلہ (۲) مضبوط پھیپھڑے (۳) اور فولادی
پاؤں کا ایک جوڑا۔ لیکن بعد میں جب مہم جُو جیسے جیسے
آگے بڑھتا جاتا ہے۔ سخت، دیوار کی طرح سیدھی اور
مشکل ترین چوٹیاں حوصلے کا امتحان لینے کے لیے راہ
میں حائل ہوتی رہتی ہیں۔ بس یہاں پر مہارت کام آتی
ہے... یہ مہارت کیا ہے... دشوار گزار راستے کیسے
طے ہوتے ہیں، برف پوش راستے، سرد ترین طوفان،
گلیشئر، گرتے ہوئے پتھر، آکسیجن کی شدید کمی اور روح
تک کو برفا دینے والے نقطۂ انجماد کے باوجود انسان
بلند پہاڑوں کو کیسے عبور کر لیتا ہے۔ اس کی تفصیل،
اگر آپ نے دلچسپی ظاہر کی تو انشاء اللہ ہم آپ کو کسی
قریبی اشاعت میں ضرور بتائیں گے۔

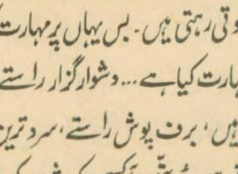


جادو کی گھڑی کا درست جواب

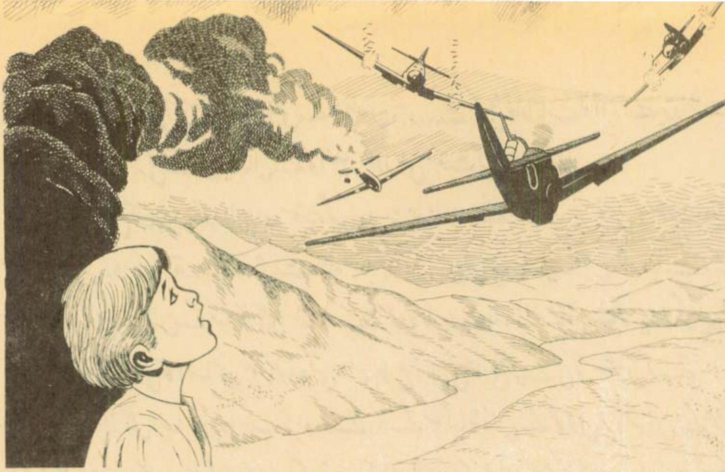

محمد سلیم مغل

# وعدہ

پہلا حصہ

یومِ دفاعِ پاکستان کے حوالے سے
لکھی گئی ایک تاثراتی تحریر

"ساون ذرا باہر جاکر دیکھو یہ مجھے آواز کون دے رہا ہے اور ہاں، اگر عثمان ہو تو اُس سے کہہ دینا کہ مُراد گھر پہ نہیں ہے۔" مُراد نے اپنے چھوٹے بھائی سے یہ بات بڑی راز داری سے کہی مگر پھر بھی نہ جانے کیسے یہ بات اُن کے بابا نے سُن ہی لی۔ یہ بات کیا سُن لی گویا بھونچال آگیا۔ انھوں نے مراد کو اپنے قریب بلایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے کئی تھپّڑ اُس کے ننھّے ننھّے گالوں پر رسید کر دیئے۔ "شرم نہیں آتی جھُوٹ بولتا ہے، وہ بھی اتنی دیدہ دلیری سے... گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی کہہ رہا ہے میں گھر میں نہیں ہوں۔" مراد کے بابا غصّے میں بڑبڑاتے بھی رہے اور جھُوٹ بولنے پر مراد کی سرزنش بھی کرتے رہے... اماں دوڑی دوڑی آئیں اور انھوں نے آکر مراد کو مزید پٹنے سے بچا لیا۔

"خدا کا خوف کرو مراد کے ابّا۔" اماں نے احتجاج کیا... "ذرا سی غلطی پر پھُول سے بچّے کی جان لوگے کیا...؟"

اماں نے مُراد کو سینے سے لگا لیا اور وہ بہت دیر تک روتا رہا اور پھر روتے روتے سو گیا۔

مراد کے ابا بھی اپنی سخت مزاجی کے ہاتھوں مجبور تھے، کوئی غلط بات تو اُن سے برداشت ہی نہ ہوتی تھی اور پھر فوجی زندگی کے بیس سال نے تو انھیں اور بھی سخت گیر بنا دیا تھا۔

کوئی شخص کتنا ہی پتھر مزاج اور سخت گیر کیوں نہ ہو، اولاد کے معاملے میں اُس کا سخت رویہ ہمیشہ تو ایک سا نہیں رہ سکتا۔ قدرت نے محبت سے بھرا ہوا دِل بھی تو باپ کے سینے میں رکھ دیا ہے۔ یہی معاملہ مراد کے بابا مہران خان کے ساتھ بھی تھا... پہلے تو وہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کر لیتے مگر کچھ دیر بعد جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اُس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے۔

اُس روز بھی ایسا ہی ہوا جب مُراد روتے روتے سو گیا تو اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے خشک نشان دیکھ کر مہران خان کا دِل بھر آیا، وہ مراد کے قریب آیا اور اُس کے بستر پر بیٹھ کر اُسے پیار سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنی اُنگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے اُسے پیار کیا اور اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اُسے نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیکھو بیٹا اچھے بچّے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی جھوٹ کو بُرا سمجھو، تمہارا شمار بھی اچھے اور سچّے لوگوں میں ہو..." اور بھی نہ جانے کیا کیا باتیں کیں، مہران خان نے۔ پھر مُراد سے کہا کہ "وعدہ کرو کہ جو کہا ہے اُس پر عمل کرو گے" "ٹھیک ہے بابا سائیں" مراد نے حامی بھری اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں...

رات کو جب مراد سونے کے لیے لیٹا تو اُسے نیند نہیں آ رہی تھی اور بیداری اور بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے وہ ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ بابا سائیں "وعدے" پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ ہر وقت وعدہ وعدہ... اور وعدہ پورا کرنے کی یقین دہانی کیوں چاہتے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار پہلے بھی جب اُس نے وعدہ کرنے کے باوجود شاہنواز کو اپنی نوٹ بُک نہیں دی تھی تو بابا کس قدر ناراض ہوئے تھے۔ اور وعدے کے موضوع پر کتنا لمبا لیکچر دے ڈالا تھا۔

اس نے اکثر اپنے بابا کو یہ کہتے بھی سنا تھا کہ "میں نے اپنے اللہ سے وطن کی خاطر جینے اور مرنے کا وعدہ کیا ہُوا ہے، میں اس وعدے کو ضرور پورا کروں گا..." یہ اور ایسی بہت سی باتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آتی رہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وعدہ انسانی زندگی میں یقیناً کوئی بہت اہم چیز ہے ننھی سی عمر میں یہ بات بھی اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اگر سب لوگ وعدہ خلافی کرنے لگیں تو انسانوں کا ایک دوسرے سے اعتماد اُٹھ جائے اور دنیا کے بہت سے کام کتنے مشکل ہو جائیں، اُس نے اپنی

دینیات کی کتاب میں یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود وعدے کے کتنے پابند تھے اور جھوٹا وعدہ کرنے والوں کو بالکل بھی پسند نہ کرتے تھے ... بہت دیر تک وہ عہد اور وعدے سے متعلق مختلف باتیں سوچتا رہا پھر جب اُس کی آنکھ لگ گئی تو اس سے قبل اُس نے اپنے ننّھے سے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات اچھی طرح بٹھالی تھی کہ میں آئندہ جب بھی وعدہ کروں سوچ سمجھ کر کروں اور جب وعدہ کرلوں تو پھر پہاڑوں کی سی سختی کے ساتھ اس کا پابند بھی ہو جاؤں۔

ہم نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مُراد چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور اُس کی عمر یہی کوئی دس گیارہ برس تھی۔ مراد کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ سب سے بڑے بھائی کا نام مانجھی اور اُس سے چھوٹی بہن کا نام سکینہ تھا۔ ساون البتہ مُراد سے دو سال چھوٹا تھا۔ ذہین اور فرمانبردار ہونے کی وجہ سے نہ صرف گھر بلکہ پورے محلّے کے لوگ مراد کو پسند کرتے، اس کی تعریف کرتے اور اُسے دعائیں دیتے ... البتہ مانجھی نکھٹو اور نالائق ہونے کی وجہ سے بالکل پسند نہ کیا جاتا ... مراد کے بابا بھی اکثر مانجھی سے ناراض رہتے اور اکثر تو یہ ہوتا کہ کئی ہفتے گزر جاتے مگر مانجھی اور مہران خان آپس میں بات نہ کرتے۔

یہ چھوٹا سا خاندان سندھ کے ریگزار تھر میں عمر کوٹ کے قریب ایک قصبے میں رہا کرتا تھا۔ مہران خان نے اپنی عمر کے بیس قیمتی سال فوج میں رہ کر گزارے تھے مگر اب بھی وہ عملاً فوج سے لاتعلق نہیں تھا۔ ریزرو فوجی کی حیثیت سے وہ اپنے گھر پہ تھا مگر اُسے یہ احساس تھا کہ وطن کی پکار کسی بھی وقت اُسے جنگ کی امتحان گاہ میں بلا سکتی ہے ... مہران خان ذہنی طور پر جہاد کے لیے تیار رہتا۔ دراز قد اور مضبوط عزائم کے مالک مہران خان کی عمر ۵۰ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی مگر وہ اب بھی جوان، پُرعزم اور باہمت دکھائی دیتا۔

۶ ستمبر کی ایک صبح تھی جب ریڈیو پہ اچانک اعلان ہُوا کہ "پڑوسی ملک نے ہمارے وطن پر حملہ کر دیا ہے۔" یہ اعلان غیر متوقع بھی تھا اور یہ خبر حیران کُن بھی ... اس سے قبل جنگ کی باتیں تو سب نے سُنی تھیں، مگر کسی نے جنگ یوں مسلط ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریڈیو پر فوجی دُھنیں اور نغمے سنائی دینے لگے، آسمانوں پر ایئر فورس کے شاہین صفت طیارے دشمن کی سرحدوں پر جاتے ہوئے نظر آئے، سرحد پہ جانے والے راستے فوجی گاڑیوں، ٹینکوں اور توپوں کی گزرگاہ بن گئے۔ قصبوں، شہروں اور دیہاتوں میں دفاعی فنڈ اور عطیات جمع کرنے کی مہم شروع ہوگئی ... ہر شخص جذبۂ جہاد سے سرشار نظر آتا۔ ہر چہرہ دل کی کیفیت کا آئینہ

بنا ہوا تھا اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ مادرِ وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے مگر وطن کے ناموس پر کوئی حرف نہ آنے دے۔

جنگ کے دوسرے روز ہی قصبے کے ریز رو فوجی اور مجاہد فورس کے سپاہی قافلے کی شکل میں وطن کی حُرمت پر مر مٹنے کا عزم لے کر سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو یہ منظر بھی دیکھنے سے متعلق تھا۔ پرانی وضع کا ایک بے ڈھب سا ٹرک جب مجاہدوں کو لے جانے کے لیے اسٹارٹ ہوا تو پوری بستی کی فضا نعرۂ تکبیر اور اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اُٹھی۔ مجاہدوں کی آنکھوں میں اُس روز ایک عجیب چمک تھی۔ ہر مجاہد پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ اُس کے پَر لگ جائیں اور وہ جلدی سے اُڑ کر سرحد پر جا پہنچے۔ بے چینی اور جذبۂ جہاد اُن کے چہروں سے عیاں تھا۔

چاچا جان، مقبول بھائی، محمد عثمان، سلام اللہ، غازی مختار، محمد علی، جلیل میاں اور اُن سب سے آگے مہران خان کھڑے ہوئے تھے۔ ان جیالوں کو دیکھتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی سیسہ پلائی دیوار کھڑی ہو۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ان میں نہ کوئی سندھی تھا نہ پنجابی، نہ پٹھان تھا نہ بلوچی ... کہنے کو سب تھے مگر آج کے روز یہ سب کلمہ گو بھائی اور ایک امّت کے سپاہی معلوم ہو رہے تھے۔

گاؤں کے بچّوں بڑوں سبھی نے ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں، کسی نے اپنے عزیزوں کے بوسے لیے اور کسی نے محبت بھری آنکھوں سے آنسوؤں اور دعاؤں کا نذرانہ دے کر رُخصت کیا...

ننھا مراد، مہران خان سے لپٹ گیا اور ضد کرنے لگا کہ "مجھے بھی سرحد پر لے کر چلو میں بھی دشمن سے لڑوں گا" مگر وہ ابھی بچہ تھا۔ جنگ کی وحشت سے ناواقف اور ویسے بھی ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ مہران خان نے ایک بار جی بھر کر اپنے بچّوں کو دیکھا... پلکوں تک آئے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی اور ٹرک پر سوار ہو گیا، مراد، ساون اور سکینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے جذبوں کی عجیب و غریب کیفیت سے تمتا رہے تھے... ٹرک جونہی منزل کی طرف روانہ ہوا، نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کی آوازیں پہلے سے زیادہ پُرجوش ہو گئیں۔ مہران خان نے آخری نگاہ اپنے بچّوں پر ڈالی اور اللہ نگہبان اللہ نگہبان کا وِرد کرنے لگا۔ نعروں کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں اور تھوڑی دیر بعد مجاہدوں کا یہ قافلہ دُور سے اُٹھنے والی گرد و غبار میں کھو گیا۔ مراد، سکینہ اور ساون دیر تک کھڑے راستے کی گرد کو تکتے رہے... آج مجاہدوں کو رخصت کرنے والوں میں سب تھے... ایک مانجھی نہ تھا مراد کا بڑا بھائی۔ لاپرواہ بے حس اور خود غرض...

دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس قصبے کے لوگ بھی بے چین تھے۔ اور جاننا چاہتے تھے کہ وطن کی

سرحدوں پر کیا ہو رہا ہے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ ہر آنے والی گھڑی فتح اور کامرانیوں کی نوید لے کر آئے۔ خبر یا اطلاعات کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا سو قصبے کے بعض لوگوں نے اپنے اپنے ریڈیو بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکر سے جوڑ رکھے تھے تاکہ ہر شخص خبریں سُن کر ملکی حالات سے باخبر رہ سکے۔

خبریں شروع ہوتیں تو مجمع لگ جاتا اور لوگ تجسّس اور بے چینی کے ساتھ گوش بر آواز ہو جاتے تھے "شکیل احمد خان کی آواز میں خبریں سنیے..." کا جملہ سُنتے ہی لوگوں کی دھڑکنوں اور چہروں کی رنگت کا عالم عجیب ہو جاتا۔ خبریں ختم ہوتیں تو حوصلے اور بلند ہو جاتے... دشمن کے جہاز مسلسل گرائے جانے اور دشمن کا علاقہ فتح کرنے کی خبریں سُن کر تو سیروں خون بڑھ جاتا۔ عام لوگوں کی طرح مراد بھی خبریں اسی شوق سے سُنتا اور بقیہ وقت میں نوافل پڑھ کر وطن کی سلامتی اور بابا کی خیریت کی دُعائیں مانگا کرتا۔ سرحد کی طرف سے کبھی کوئی فوجی گاڑی آتی نظر آتی تو بستی کے سب لوگ اس گاڑی کا راستہ روک کر اپنے اپنے پیاروں کی خبر لیا کرتے۔

راشن اور پانی کے لیے آنے والی ایک فوجی گاڑی نے بتایا کہ مجاہد فورس کے ایک دستے نے مہران خان کی قیادت میں دشمن کی ایک چوکی پر قبضہ کر لیا ہے اور یہ کہ تمام مجاہدین خیریت سے ہیں۔ یہ خبر مراد نے اپنے کانوں سے سُنی اور پھر بھاگا بھاگا گھر آیا تاکہ جلدی سے اماں کو یہ خبر سنائے۔ مراد آج بہت خوش تھا... اتنا خوش پہلے تو اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا... وہ چیخ چیخ کر اور خوش ہو ہو کر اپنے بابا اور پاک فوج کی بہادری کے قصے سب کو سناتا۔ سب ہی اُس کی باتوں کو سُن کر خوش ہوتے اور اُس کا حوصلہ بڑھاتے سوائے اس کے بڑے بھائی مانجھی کے... ایک روز تو مانجھی نے کہہ دیا کہ "کوئی تیر نہیں مار لیا ہماری فوج نے... یہ خبریں جھوٹی ہیں جو ہمیں سنائی جاتی ہیں۔" یہ بات ننھے سے دِل کو دُکھا گئی اور وہ دیر تک روتا رہا۔ آج وہ پہلے سے زیادہ مضطرب اور بے چین تھا۔ آج اُسے اپنے بابا بہت یاد آرہے تھے۔

---

نصف شب گزر چکی تھی۔ قصبے کے کسی شخص نے دُور سرحد کی طرف سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سُن کر پُورے گاؤں کو جگا دیا... لوگ سرحدی راستے پر جمع ہونے لگے۔ ایک گاڑی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بتیاں بجھائے ہوئے قریب آتی محسوس ہوئی... گاڑی آکر رُکی تو پتا چلا کہ یہ ریڈ کراس کی ایمبولینس ہے۔ جو زخمی فوجیوں کو سرحد سے لے کر آرہی ہے۔ ایمبولینس میں موجود ایک فوجی افسر نے بتایا کہ آپ کے گاؤں کے دو مجاہد لاپتہ ہیں اور ایک مجاہد شہید ہو گیا ہے۔

"شہید ہو گیا ہے...!" ہر چہرہ شہید کا نام جاننے کے لیے مضطرب ہو گیا... "ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں

جانتے"۔ فوجی افسر کے اس جواب سے سب چہرے مرجھا گئے ۔ ایمبولینس آگے بڑھ گئی ... ہر چہرہ اُداس اور فکر مند ہو گیا ۔

ہر شخص کی آنکھوں میں اس کے عزیز کا چہرہ گھوم گیا جو جامِ شہادت نوش کرنے کا عزم لے کر میدانِ کارزار کو گیا تھا ...

مراد جو پہلے ہی بے چین تھا آج بے حد افسردہ نظر آرہا تھا ۔ سکینہ ، ساون اور اماں سب ہی پریشان تھے
"خدا خیر کرے ..." اماں نے کلیجہ تھامتے ہوئے کہا اور نماز کے لیے وضو کے ارادے سے پانی لینے چلی گئی
مراد ، حیرت کی تصویر بنا بت کی طرح نہ جانے کب تک گھر کے آنگن میں کھڑا رہا ۔

پھر کیا ہوا ... ؟

شہادت کا مرتبہ کس نے پایا ... ؟

یہ سب کچھ جاننے کے لئے اس کہانی کا دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ضرور پڑھئے ۔

★

## کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

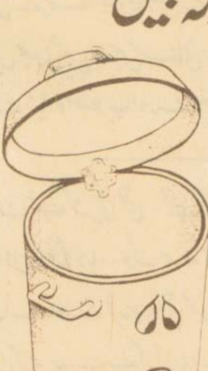

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے ۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے ۔
مجھے میرا حق دیجیے ۔
ورنہ !
مکھیوں ، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے ۔

# آخری خواب

سلمان غزالی

وہ اپنے خواب کی تعبیر سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن ...

وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔ اسکا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے آج تیسری بار یہ خواب دیکھا تھا۔ تین دِن سے خواب میں وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال سے ہی وہ کانپ جاتا۔ ایک ہی خواب بار بار دیکھنا کسی عام انسان کے لئے تو شاید اتنا تشویش کا باعث نہ ہوتا

مگر اس کی زندگی میں خواب ہمیشہ ایک نیا موڑ بن کر سامنے آئے تھے۔ اُسے یاد آیا جب وہ صرف آٹھ ۹ سال کا تھا۔ ایسا ہی ایک خواب دیکھا تھا۔ لگاتار تین دن تک۔ اُسے اپنے ہر طرف آگ ہی آگ نظر آتی تھی اور پھر حقیقت میں دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ جل گیا۔ اُس کے والد کی فیکٹری، گودام ہر چیز راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی یہ سب کچھ کیسے ہوا کوئی نہ جان سکا جب کچھ ہوش آیا تو وہ بنگلے سے کرائے کے بوسیدہ مکان میں آچکے تھے۔ اور پھر جب اُس نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تو انہی خوابوں کی آگ میں اُس کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ اُس کے والد، والدہ اور بہن ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور اکیلا رہ گیا۔ اُس کے والد نے جیسے تیسے کر کے اُسے تعلیم دلوائی تھی۔ تعلیم اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اس نے اِس دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ اور آج وہ دولت مند تو نہیں تھا۔ مگر اُس کا اپنا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ مگر جو کچھ اُس کے پاس تھا وہ مستقبل کی ضروریات کے لئے کافی نہ تھا اور اُس نے آئندہ کے بہت سے پروگرام بنائے تھے۔ مگر اپنے مستقبل کی جو تصویر اُس نے خواب میں دیکھی تھی وہ بہت بھیانک تھی "چھوٹی سی تاریک کوٹھری چاروں طرف اونچی اونچی سیلن زدہ دیواریں۔ جن میں کوئی کھڑکی اور روشندان نہیں صرف ایک چھوٹا سا دروازہ ہے کوٹھری میں ایک طرف پرانا سا بستر جس کے سامنے ایک واش بیسن ہے جس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا شیشہ جھول رہا ہے۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے چہرے کی جھرّیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گویا وہ بوڑھا ہو رہا ہے مگر وہ غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور وہاں سے نکل نہیں سکتا؛ نہیں نہیں میں ایسا وقت نہیں آنے دوں گا" وہ بستر سے اُتر کر آیا اور پریشانی کے عالم میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔" میں یہ خواب سچ نہیں ہونے دوں گا۔ میں پہلے ہی اتنی دولت جمع کر لوں گا کہ مجھے اپنی زندگی کے آخری دن یوں بے بسی کی حالت میں نہ گزارنے پڑیں اگر میں یہی معمولی نوکری کرتا رہا تو اسی طرح کا کوئی تنگ و تاریک مکان میرا مقدّر بن جائے گا۔ مجھے جلد ہی اتنی دولت جمع کر لینی چاہیئے کہ میری ساری زندگی پھر آرام سے گزرے۔ ماضی میں جو ناقابلِ تلافی نقصان مجھے اِن خوابوں نے پہنچایا ہے۔ میں انہیں دوبارہ حقیقت بننے نہیں دوں گا،،" مگر اتنی رقم آئے گی کہاں سے،،" اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا اور پھر اُسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور وہ پُرسکون ہو گیا۔

دو دن بعد اُس نے کرائے پر گاڑی حاصل کی اور تیار ہو کر اپنے علاقے کے بینک کے سامنے پہنچ گیا۔ اُس نے گاڑی بینک کے سامنے کھڑی کی اور بینک میں داخل ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا بینک تقریباً خالی تھا۔ وہ کیشیئر کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیگ سے ایک پرچی نکال کر کیشیئر کی طرف بڑھا دی اور ساتھ ہی بیگ سے باہر جھانکتی

ریوالور کی نالی کا رخ کیشیئر کی طرف کر دیا۔ کیشئر کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے پرچی پڑھی "بینک میں جتنی بھی رقم موجود ہے۔ میرے حوالے کردو۔ خاموشی کے ساتھ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔" کیشیئر نے رقم تھیلے میں بھرنی شروع کردی اور پھر لفافہ اُس کی طرف بڑھایا اور ساتھ ہی پاؤں کے پاس موجود الارم کا بٹن دبا دیا۔ الارم کی آواز سنتے ہی گارڈ بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ وہ گارڈ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اور گارڈ پر فائر جھونک دیا۔ گولی گارڈ کے سینے میں لگی اور وہ وہیں پر گر گیا وہ بھاگتا ہوا بینک سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی اُس نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ فائر کی آواز آئی اور اُس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ اُس نے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی مگر پولیس اُسے گھیرے میں لے چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔

مقدمہ چلا اور اُسے بنک ڈکیتی اور ایک گارڈ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا سنا دی گئی کانسٹیبل نے اُس کے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑی اور اُسے لے کر پولیس وین میں بیٹھ گیا۔ وین چل پڑی اور وہ سوچنے لگا۔ "میں نے جو چاہا تھا۔ وہ نہیں ہو سکا قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ مگر میں نے اس منحوس خواب کو بھی سچ نہیں ہونے دیا۔ اب میں مطمئن ہوں گو کہ میرا مقصد پورا نہیں ہو سکا مگر میں نے اپنی تقدیر کو شکست دے دی ہے۔" اور وہ واقعی مطمئن ہوگیا۔ اب وہ بہت پرسکون بیٹھا تھا۔ وین ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی وہ جیل کے آہنی دروازے پر تھے۔ جیل کی سلاخوں کے سامنے سے گزر کر وہ ایک کمرے میں آگئے جہاں سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ جہاں بہت سارے دروازے نظر آرہے تھے۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" اُس نے حیرت سے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"عمر قید کے مجرموں کو یہیں رکھا جاتا ہے"، یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل نے ایک دروازہ کھولا اور اُسے کوٹھری میں دھکیل دیا اسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں آگیا ہو۔ اُس تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک طرف ایک پرانا سا بستر لگا ہوا تھا۔ جس کے سامنے ایک واش بیسن تھا۔ جس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا شیشہ جھول رہا تھا۔ اب اُسے یہاں عمر گزارنی تھی ہاں یہ وہی جگہ تو تھی، بالکل وہی منظر تھا۔ جو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

ترسیلِ زر اپنے بینک کے ذریعے کیجئے۔

# محفوظ بھی اور
# باکفایت بھی

فوری ترسیل کے لئے

## نیشنل بینک آف پاکستان

کی شاخیں ملک کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔
اور درج ذیل مرکزوں میں "فیکس" کی سہولت بھی حاصل ہے۔
ان مرکزوں کے درمیان ترسیلِ زر کے سلسلے میں آپ کے
ارشاد کی تعمیل پلک جھپکتے میں ہو جاتی ہے۔

**DOMESTIC FAX** stations and their call numbers.

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| 1) | Islamabad | 814987 | 7) | Peshawar | 72553 |
| 2) | Lahore | 321100 | 8) | Multan | 33570 |
| 3) | Gujranwala | 41297 | 9) | Faisalabad | 22784 |
| 4) | Hyderabad | 20169 | | | |
| 5) | H.O. Karachi | 2417697 | | | |
| 6) | Quetta | 75205 | | | |

**FOREIGN FAX** stations and their call numbers:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| 1) | Newyork | 004-212-344-8826 | 7) | Bahrain OBU | 00-973-274411 & 244186 |
| 2) | London | 00-44-1-638-7869 | 8) | Hongkong | 00-852-5-8451703 |
| 3) | Knightsbridge | 00-44-1-235-4705 | 9) | Kowloon | 00-852-3-691780 |
| 4) | Glasgow | 00-44-41-331-1091 | 10) | Tokyo | 00-81-3-502-0359 |
| 5) | Manchester | 00-44-61-835-1049 | 11) | Seoul | 00-82-2-734-5817 |
| 6) | Frankfurt | 00-49-69-74-8151 | 12) | Beijing | 00-86-1-500-3228 |

بینک الجزیرہ کی تمام شاخوں میں فیکس کی سہولت موجود ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان
بہتر کارکردگی
جدید ٹیکنالوجی

ہیڈ آفس: آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی، پاکستان

ٹیلی فون: ۲۴۱۶۷۸۰ - ۱۰ لائنز - ۲۴۱۴۰۴۱ - ۵ لائنز۔ ٹیلکس: ۲۷۳۴ - ۸۰۶۷ - ۲۳۷۳۳ - ۲۳۷۲۳ - این بی پی - پی کے

United

PID 1 13/89

# جستجو شرط ہے

ذہانت اور معلومات کا منفرد ماہانہ مقابلہ

**اسامہ بن سلیم**

ہم نے آپ سے پوچھا تھا کہ "جستجو شرط ہے" کا سلسلہ ختم کر دیا جائے یا اسے مزید چلتے رہنے دیا جائے ہمیں کوئی ایک خط بھی ایسا موصول نہیں ہوا جس میں اس سلسلے کو بند کرنے کے لیے کہا گیا ہو۔ آپ کی رائے سر آنکھوں پر یہ سلسلہ ہم یونہی چلا رہے ہیں

باوجودیکہ ہم ہر بار نئے ساتھیوں کو اس مقابلے میں شرکت کا طریقہ بتاتے رہتے ہیں، مگر پھر بھی شاید بعض کم عمر ساتھی اسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔

لیجئے ... توجہ سے پڑھیے ... کہیں پھر کوئی غلط فہمی شکایت کا باعث نہ بن جائے۔

ہم آپ سے کسی بھی سوال کا جو جواب پوچھ رہے ہوتے ہیں، دراصل وہ پورا جواب اسی سوال کے ساتھ ترتیب سے دیئے ہوئے بہت ناموں میں موجود ہوتا ہے ... جواب کا پہلا حرف پہلے نام یا لفظ میں موجود ہے۔ دوسرا حرف دوسرے نام میں، اس طرح ہر نام میں سے ایک ایک حرف چنتے چلے جائیے۔ آپ کا جواب آپ کو مل جائے گا۔

مثلاً ہم نے آپ سے ایک سوال پوچھا کہ ایک فریضے کا نام بتائیے۔

اس کا جواب ہے "حج"... اب "حج" کو ہم کس طرح الفاظ میں چھپا دیتے ہیں۔ اس پر غور کیجیے۔ ہم نے سوال کے ساتھ دو الفاظ لکھے (۱) حدیبیہ (۲) جنّت البقیع۔

گویا "حج" کا 'ح' حدیبیہ میں موجود ہے اور "حج" کا 'ج' جنّت البقیع میں ... اب تو امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ جواب تک پہنچنے کے لیے شعر کا ایک مصرعہ بھی ہم شائع کرتے ہیں۔ آپ غور کریں تو یہ مصرعہ بھی ایک واضح اشارہ ہوتا ہے ... دیکھیے ہم نے بہت چھوٹے بچوں کی طرح آپ کو بہت ہی تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اب قلم کاغذ لے کر

تیار ہو جائیے۔ آپ کا ذہنی اور علمی امتحان حاضر ہے ۔
آپ کے جواب ماہِ رواں کی آخری تاریخ تک آجانے چاہئیں۔
ہم قرعہ اندازی کے ذریعے تین انعامات آپ کو ضرور دیں گے ۔
جواب کے ساتھ کوپن کا آنا شرط ہے

۱۔ قرآن مجید کی سورتوں میں ایک سورۃ کا نام تلاش کیجئے ۔
۱۔ اخلاص ۲۔ فیل ۳۔ عصر ۴۔ احزاب ۵۔ مزمّل ۶۔ نساء
اشارہ:۔ کوئی منکر خدا کی نعمتوں سے ہو بھلا کیوں کر ؟

۲۔ نوبل پرائز حاصل کرنے والی شخصیات اور اداروں میں ایک محترم نام پوشیدہ ہے۔ آپ کی ذہانت اسے تلاش کرسکتی ہے ۔
۱۔ مدر ٹریسا ۲۔ عبدالسّلام ۳۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۴۔ انوار السادات ۵۔ مارٹن لوتھر کنگ ۶۔ انٹرنیشنل ریڈکراس ۷۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل ۸۔ نجیب محفوظ ۹۔ چرچل ۱۰۔ یونیسف
اشارہ:۔ نیک مادام، تیری عظمت کو سلام

۳۔ بین الاقوامی شہرت کا حامل ایک عظیم مصور، اسے دوسرے عظیم مصور کے ناموں میں دیکھیے۔
۱۔ وان گو ۲۔ لیونارڈو داونچی ۳۔ مائیکل اینجلو ۴۔ ریمبراں
اشارہ:۔ کیا کیا گل مہکائے ہیں جی دیکھو تو تم ایک نظر

۴۔ آنکھوں سے محروم دنیا کی عظیم شخصیات میں ایک ایسی ہی شخصیت جس نے بین الاقوامی شہرت اور بڑا مقام حاصل کیا۔
۱۔ ہیلن کیلر ۲۔ بیتھوون ۳۔ فاطمہ شاہ ۴۔ لوئی بریل
اشارہ:۔ آنکھوں کے بِن مشاہدہ شاعر بنا گیا

۵۔ دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں میں ایک اہم اور معروف زبان بتایئے تو کون سی ہے ۔
۱۔ فارسی ۲۔ انگریزی ۳۔ اردو ۴۔ ہندی ۵۔ ہسپانوی ۶۔ اطالوی ۷۔ سنسکرت ۸۔ عربی
اشارہ:۔ فرفر سیکھ لی ہے یہ ساں سی سی سی بولی

۶۔ ریل گاڑی تو نہیں البتہ ریل گاڑیوں کے ایک مخصوص نظام کا نام دنیا کی مختلف مشہور ٹرینوں کے ناموں میں تلاش کیجیے۔

۱۔ گومتی (انڈیا) ۲۔ تیز گام (پاکستان) ۳۔ میگیلٹو (فرانس) ۴۔ راجدھانی (انڈیا) ۵۔ بلٹ (جاپان)

اشارہ۔ زیرِ زمین تیز سے ہے تیز تر سفر

۷۔ سیاست کے حوالے سے شہرت پانے والی خواتین میں سے ایک مشہور نام بتایئے تو کس کا ہے۔

۱۔ مارگریٹ تھیچر ۲۔ حسینہ واجد ۳۔ رضیہ سلطانہ ۴۔ سروجنی نائیڈو ۵۔ کوئین الزبتھ ۶۔ ملکہ وکٹوریہ ۷۔ بندرا نائیکے ۸۔ اندرا گاندھی

اشارہ۔ میرے غاصب عدو کا نام ہے یہ غور کر لینا

۸۔ اولمپک کھیلے جانے والے شہروں میں ایک ایسا ہی شہر پوشیدہ ہے۔ جہاں اولمپک ہو چکے ہیں بتایئے تو؟

۱۔ میونخ ۲۔ لاس اینجلس ۳۔ سیول ۴۔ میکسیکو ۵۔ مونٹریال

اشارہ۔ یہ ہم وزن ہے "آسکو" مگر کوئی نہ آسکے

۹۔ ایندھن یا توانائی کی مختلف قسموں میں سے ایک، ہماری روزمرہ کی ضرورت، نام پہچانیے، ضروری نہیں کہ یہ نام اردو ہی میں ہو۔

۱۔ الکوحل ۲۔ ایتھر ۳۔ اسپرٹ ۴۔ کوئلہ ۵۔ گیس ۶۔ ڈیزل ۷۔ شمسی توانائی۔

اشارہ۔ گھر کے دیئے جلائے، چولہے تک دہکائے

۱۰ اعلیٰ تحقیقی و تدریسی درسگاہ۔ دنیا کی معروف جامعات میں سے ایک، کیا آپ نام بتا سکتے ہیں ؟

۱۔ علیگڑھ ۲۔ عثمانیہ ۳۔ پرنسٹن ۴۔ منی سوٹا ۵۔ کیمبرج ۶۔ آکسفورڈ۔

عجیب سا ہے ورڈ یہ سُنا ہُوا ہے بارہا

## ماہ اگست ۱۹۸۹ء کے درست جوابات

۱۔ مدوجزر ۲۔ مجید لاہوری ۳۔ خوجی ۴۔ مکی ماؤس ۵۔ درباری ۶۔ ستار ۷۔ ۸۔ ونگ کمانڈر ۹۔ سیالکوٹ ۱۰۔ بیڈن پاول

## انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

۱۔ عدنان فاروقی۔ گلبرگ کراچی ۲۔ فاطمہ خلیل۔ سمن آباد لاہور ۳۔ ندیم احمد ثاقب چوہدری اسٹریٹ نمبر ۵ شرقی محلہ فاروق آباد بہاولنگر۔

## درست جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

رفعت خان - کلور کوٹ بھکر
ثوبیہ طلعت - فیڈرل بی ایریا کراچی
عظمیٰ ادریس - رامسوامی کراچی
سلمان راشد - نارتھ ناظم آباد
طٰہٰ جعفری - عزیز آباد کراچی
محمد ناصر - ناظم آباد کراچی
اقصیٰ حکیم - فیض آباد کالونی خیر پور سندھ
شفیق الرحمٰن - حالی نگر حیدرآباد
محمد ظفر رضا - فاروق آباد بہاولنگر
محمد عاطف - گل گشت کالونی ملتان
محمد محسن انصاری - شاہ خرم کالونی ملتان
عبدالقدوس قریشی - پنڈداد نخان جہلم

ذوالفقار حیدر - سنجھورو
قیصر محمود - لطیف آباد حیدرآباد
اللہ دتہ عطیل، خانیوال
محمد عمران قادر، ٹنڈوآدم
سارہ جاوید زبیری، نارتھ کراچی
محمد فیصل یونس، ناظم آباد کراچی
مرتضیٰ علی خان - پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی
حامد علی شاہد - چکوال
علی پرویز - اسلام آباد
محمد ریحان - اسلام آباد
اکبر منیر - سیکٹر جی - اسلام آباد
سعدیہ اعظم - خیابانِ سرسید راولپنڈی

اس کوپن کے بغیر جستجو شرط ہے کے مقابلے میں شرکت ممکن نہیں

نام ـــــــــــــــ کلاس ـــــــــــــــ عمر ـــــــــــــــ

پتہ ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

حاصل کردہ پوائنٹس ـــــــــــــــــــــــــــ

طاہر مسعود

# پُراسرار آواز

کردار

جاوید ۔ اُنیس سال کا ایک بے انتہا ڈرپوک اور توہم پرست لڑکا ۔

اسد ۔ جاوید کا دوست جو امتحان کے دوران کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے اُس کے گھر ٹھہرا ہوا ہے ۔

**پہلا ایکٹ** ۔ رات ڈیڑھ بجے کا وقت جاوید اور اسد کمرے میں بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں ۔ ٹیبل کی لیمپ کی روشنی میں اُن کے بڑے بڑے سائے دیوار پر پڑ رہے ہیں ۔ جس کی وجہ سے کمرے کا منظر پُراسرار سا ہو گیا ہے ۔ دیوار کے ساتھ دو بیڈ اور الماریاں ہیں ۔ پورا کمرہ بے ترتیب اور بکھرا ہوا ہے ۔

جاوید ۔ (پڑھتے ہوئے چونک کر) اسد! کوئی آواز سُنی تم نے ؟

اسد ۔ آواز ؟ کیسی آواز ۔

جاوید ۔ چھت پر کسی کے چلنے کی ۔

اسد ۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے ۔ پڑھنے دو مجھے ۔ پرسوں پیپر ہے ۔

جاوید ۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ۔ کل بھی ٹھیک ڈیڑھ بجے اوپر چھت سے ایسی ہی آوازیں آنے لگی تھیں ۔ جیسے کوئی چل رہا ہو ۔ تم اُس وقت سو رہے تھے ۔

اسد ۔ تم اپنے کان کا علاج کراؤ ۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے ۔ بھلا اتنی رات گئے چھت پر کون آسکتا ہے ۔

جاوید ۔ (گھبرا کر) شش ! دیکھو پھر وہی آواز ۔

(دھپ دھپ کی آوازیں اُوپر سے آتی ہیں)

جاوید۔ کچھ سُنا تم نے۔
اسد ۔ ہاں کوئی بلی وِلی ہوگی۔
جاوید۔ بلی کے چلنے کی آواز اتنی زور دار نہیں ہو سکتی۔
اسد ۔ (بے نیازی سے) کوئی بھی ہوگا۔ تمہیں کیا۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔
جاوید۔ مجھے تو بڑی سخت گڑبڑ لگتی ہے۔ ابا جان جب یہ مکان خرید رہے تھے اُسی وقت لوگوں نے بتا دیا تھا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔
اسد ۔ یار۔ یہ سائنسی دور ہے۔ آسیب وغیرہ کی باتیں اب بڑی پُرانی ہو گئی ہیں۔
جاوید۔ (ناراض ہو کر) تمہیں ایسے یقین نہیں آئے گا۔ کسی دن ملاقات ہو جائے گی نا بچُّو پھر پتا چلے گا۔
اسد۔ میری تو بڑی تمنا ہے کہ کسی آسیب سے ملاقات ہو۔ میں اُس کے ساتھ شام کی چائے پیئوں گا اور ہاں اُسے ٹیبل ٹینس کھیلنے کی بھی دعوت دوں گا۔ کتنا مزہ آئے گا۔ میں اور آسیب ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہوں گے۔

جاوید ۔ اچھا اب بے کار کی باتیں نہ کرو۔ پتا نہیں تم کس مٹی سے بنے ہوئے ہو۔
اسد ۔ اُس مٹی سے جس سے حضرت آدمؑ بنے تھے۔
جاوید ۔ امی بتاتی ہیں گاؤں میں اُن کے گھر کہیں باہر سے ایک بلی روز نہ آجاتی تھی۔ بہت موٹی تازی۔ ایک روز جب وہ سامنے سے گزر رہی تھی تو کسی نے کہہ دیا: "اللہ۔ کتنی موٹی بلی ہے"۔ پتا ہے کیا ہُوا؟
اسد ۔ کیا ہُوا؟
جاوید۔ بلی گردن موڑ کر کہنے لگی "کیا تمہارے باپ کا کھا کر موٹی ہوئی ہوں"۔
(اسد ہنسنے لگتا ہے)

جاوید۔ تم ہنس رہے ہو!
اسد ۔ تو کیا مارے ڈر کے بیہوش ہو جاؤں۔
جاوید۔ امی کہتی ہیں ایسی باتوں پر ہنسنا نہیں چاہیئے۔ نقصان پہنچ سکتا ہے۔
اسد ۔ مجھے تو آج تک نہیں پہنچا۔ حالانکہ میں ہمیشہ ایسی باتوں پر ہنستا ہُوں۔
جاوید۔ ہندوستان میں میرے تایا کے قبضے میں جن تھے۔ چند سال پہلے جب ابا وہاں گئے تو انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔
اسد ۔ کیا دیکھا تھا؟

جاوید۔ وہ ایسا ہوا کہ ابا صحن میں بیٹھے تایا سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک چار پانچ موٹے موٹے خوب بڑے بڑے بلے آ گئے۔ بالکل شیر جتنے۔ بلکہ وہ دیکھنے میں بالکل شیر لگ رہے تھے۔ وہ آئے اور آکر تایا کو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گئے۔ پھر تایا نے انھیں خُوب ڈانٹا۔ ہمارے ابا جو ڈر گئے تھے۔

اسد ۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ سلام کا جواب دے دینا چاہیے تھا۔

جاوید۔ تم دے دینا۔ اگر کبھی ملاقات ہو تو۔

اسد ۔ اور کیا۔ جنوں اور آسیبوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ وہ انسانوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

جاوید۔ ابا بتاتے ہیں وہ بچپن میں جس مدرسے میں پڑھتے تھے وہاں ایک مرتبہ بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس مدرسے میں ایک لڑکا محمد باقر بھی پڑھتا تھا۔ دُبلا پتلا سا تھا اور ہر وقت خاموش خاموش رہتا تھا۔ ایک دن مولوی صاحب نے اُس سے کہا "باقر میاں

"باقر میاں۔ میں گھر پر اپنا تھیلا بھُول آیا ہوں ذرا بھاگ کرکے لے آنا" باقر کہنے لگا۔

"بہت بہتر مولوی صاحب" پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اُس کا ہاتھ آہستہ آہستہ لمبا ہونا شروع ہُوا اور اتنا لمبا ہُوا کہ بڑھتے بڑھتے مسجد سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈوں میں مولوی صاحب کا تھیلا اُن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لڑکوں میں تو چیخ پکار مچ گئی۔ مولوی صاحب بھی گھبرا گئے۔ اسی دن کے بعد سے پھر باقر مدرسے نہیں آیا۔ ابا بتاتے تھے کہ مولوی صاحب نے اُس سے کہہ دیا کہ جب تک بات چھُپی ہوئی تھی ٹھیک تھا۔ لیکن اب مدرسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہیں ہے۔

اسد ۔ یار جاوید۔ اس قسم کے لڑکوں سے اگر میری دوستی ہو جائے نا تو میں تو بہت انجوائے کروں... کتنے مسائل گھر بیٹھے حل ہو جایا کریں۔

جاوید ۔ کہنا آسان ہے دوست۔ جب ایسی مخلوق سے واسطہ پڑتا ہے نا تو ہوش اُڑ جاتے ہیں۔

اسد ۔ کاش! کبھی میرا واسطہ پڑے۔ میری تو بچپن سے خواہش ہے۔ پتا ہے، ایک بار میں نے پوری رات قبرستان میں گزاری۔ صرف اسی امید پر کہ شاید کسی جن بھُوت سے ملاقات ہو جائے لیکن اب لگتا ہے کہ جن چاچا اور بھُوت ماموں مجھ سے کچھ ناراض رہتے ہیں، کچھ ہُوا ہی نہیں، میں ایک خالی قبر میں پڑا رہا۔ اور کوئی بھی نہیں آیا

(چھت سے دھپ دھپ کی آوازیں)

جاوید۔ (ڈر کر) اسد!

اسد ۔ یار تم تو بہت ڈرپوک ہو آؤ چھت پر چل کر دیکھتے ہیں۔

جاوید ۔ نہیں نہیں میں نہیں جا سکتا ۔ میں تمہیں بھی نہیں جانے دُوں گا ۔

اسد ۔ کیا بچّوں جیسی باتیں کر رہے ہو

جاوید ۔ (سُنی ان سُنی کر کے) گھر والوں کو بھی آج ہی حیدر آباد جانا تھا ۔ اب کیا کریں؟

اسد ۔ کرنا کیا ہے چل کر پتا تو کرتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کوئی چور ہو ۔

جاوید ۔ (غصّے سے) احمق ہو تم ۔ چور کو چھت پہ چہل قدمی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اسد ۔ بھئی میں تو جا رہا ہوں اُوپر ۔ تم بھی چلو (جاوید کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے ۔ چونک کر) ارے! تمہیں تو پسینہ آ رہا ہے۔

جاوید ۔ (جھینپ کر) وہ گرمی کی وجہ سے ۔

اسد ۔ گرمی ؛ ہوش کی دوا لو جاوید ۔ اتنی سردی میں تمہیں گرمی لگ رہی ہے ۔

جاوید ۔ اچھا... اچھا تم بیٹھ تو جاؤ۔

اسد ۔ نہیں تم بیٹھے رہو ۔ میں ابھی آتا ہوں ۔

(دروازہ کھول کر نکل جاتا ہے)

جاوید ۔ (بڑبڑاتا ہے) یا اللہ اسد کو اپنی حفاظت میں رکھنا ۔ اُف مجھے تو سردی لگ رہی ہے ۔ چادر کہاں ہے؟

(الماری کھول کر چادر نکال کر اوڑھ لیتا ہے ۔ چھت سے دھپ دھپ کی آوازیں پھر آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ خوفزدہ ہو کر بستر پر چلا جاتا ہے اور تکیئے میں منہ چھپا لیتا ہے ۔ اچانک اسد کی چیخ سُنائی دیتی ہے ۔ اور پھر دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز ۔ جاوید اُچھل کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔)

جاوید ۔ (چیختا ہے) اسد! اسد!!! میرے خدا یہ کیا ہو گیا ۔ میں کیا کروں ۔

(کمرے کا دروازہ کھلتا ہے ۔ دروازہ کھلنے کی آواز سُن کر جاوید کا چہرہ فق ہو جاتا ہے ۔ اور وہ جذباتی طریقے سے چیخنے لگتا ہے ۔ کمرے میں اسد لنگڑاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

اسد ۔ چیخ کیوں رہے ہو ۔

جاوید ۔ (بے یقینی سے) اسد تمُ ۔

اسد ۔ ہاں ۔ آسیب نے آج تو مار ہی ڈالا تھا ۔ ہائے (کراہتا ہے)

جاوید ۔ کیا ہُوا ۔ بتاؤ ۔ پوری بات بتاؤ

اسد ۔ میں جو نہی سیڑھیاں چڑھنے لگا ۔ مجھے لگا جیسے مجھے کسی نے زور سے دھکا دے دیا ہو ۔ دھکے کے

زور سے بچنے کے لیے جیسے ہی میں نے دیوار کا سہارا لینا چاہا کسی نے نیچے سے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

جاوید ۔ (ہکلاتے ہوئے) نن نن نن نہیں ۔

اسد ۔ ہاں میرے دوست بالکل یہی ہُوا ۔ میری تو ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوگئی ہے ۔

جاوید ۔ مم مم مجھے سردی لگ رہی ہے ۔

اسد ۔ تم نے پہلے ہی چادر اوڑھ رکھی ہے ۔ کیا میں تمہیں لحاف اوڑھا دوں ۔

جاوید ۔ (روتے ہوئے) حیدرآباد فون کرکے امی ابو کو بلا دو ۔

اسد ۔ بے وقوف نہ بنو جاوید ۔ فرسٹ ایڈ بکس نکالو ۔ میری ٹانگ ۔ اے ہائے (کراہتا ہے)

جاوید ۔ اسد کی حالت دیکھ کر اپنے اوپر قابو پاتا ہے) ٹھہرو میں ابھی فرسٹ ایڈ بکس نکالتا ہوں ۔
(الماری کھولتا ہے لیکن پھر کچھ بھول جاتا ہے ۔ عجیب گھبراہٹ سی اس پر طاری ہے) تھوڑی دیر میں وہ اسد کی مرہم پٹی کر رہا ہوتا ہے ۔

اسد ۔ جاوید...

جاوید ۔ کیا ہے ؟

اسد ۔ تم اتنے احمق کیوں ہو ؟

جاوید ۔ میں مطلب نہیں سمجھا ۔

اسد ۔ اوپر چھت پر کوئی بھی نہیں تھا ۔

جاوید ۔ پھر یہ دھپ دھپ کی آوازیں ۔

اسد ۔ یہ تمہارے پڑوسی صاحب اپنی دیوار پر کچھ ٹھونک بجا رہے تھے ۔

جاوید ۔ اور یہ تمہیں دھکا کس نے دیا تھا ؟

اسد ۔ کسی نے بھی نہیں ۔ سیڑھی پر کیلے کا چھلکا پڑا تھا ۔ پاؤں پھسل گیا تو گر پڑا ۔

جاوید ۔ کیا تم سچ بول رہے ہو ؟

اسد ۔ اور کیا ... اب تم مان لو کہ جنوں اور آسیبوں کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ تمہیں ڈرانے دھمکانے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں ۔ کیا سمجھے ۔

جاوید ۔ (شرمندگی سے) سمجھ گیا ۔

(دونوں ہنس پڑتے ہیں، پردہ گرتا ہے)

# کاش

کووینٹری پیٹ مور کی نظم "دی ٹوائز" سے ماخوذ

شاھنواز فاروقی

میرا بیٹا عمر جس کی دس برس ہونے کو ہے
جس کا بچپن کچھ برس کے بعد بس کھونے کو ہے

جس کی آنکھیں ہیں محبّت اور ذہانت سے بھری
جس کی ماں دو سال سے ہے قبر میں سوئی ہوئی

آنے جانے سے کہیں بے طرح گھبراتا ہے جو
دوستوں میں اپنے افلاطون کہلاتا ہے جو

عام بچّوں کی طرح جو ضد نہیں کرتا کبھی!
جس کے ہونٹوں پر بڑی مشکل سے آتی ہے ہنسی

شام کو دفتر سے تھک کر جب میں پہنچا اپنے گھر
پاؤں تھے بوجھل مرے، چکرا رہا تھا میرا سر

اُس کو چُومے بن، مَیں پہلی بار کچھ بے زار سا
ساتھ ہی جوتوں کے اپنے بستر پر جا پڑا

اُس نے اُس دن جب مرا کہنا نہ مانا بار بار
ہو گیا اعصاب پر میرے بہت غصّہ سوار

اُٹھ کے بستر سے یکایک اُس کے اِس چونچال پر
اک طمانچہ میں نے مارا اُس کے ننھے گال پر

کھا کے تھپّڑ اُس نے مجھ کو بے یقینی سے تکا
اور پھر سَر کو جھُکا کر اپنے کمرے میں گیا

چند لمحوں بعد جب غصّہ میں کچھ آیا اُتار
بھر گیا دِل میں مرے رنج و ندامت کا غُبار

شرم آئی مجھ کو اور پھر ہو کے کچھ بے تاب سا
دوڑ کر میں بے تحاشہ اُس کے کمرے میں گیا

میں نے دیکھا میرا بیٹا سو گیا روتے ہوئے
آنسوؤں سے اُس کے دونوں گال تھے بھیگے ہوئے

جا بجا بکھرے تھے اُس کے سب کھلونے فرش پر
شیر، بندر، ریچھ، کُتّا، مرغ، بلّی اور شُتر

دیکھ کر یہ حال، دل رنج و الم سے بھر گیا
اور مجھ میں غصّہ ور انساں سدا کو مَر گیا

میں نے سوچا، ہم بڑے بھی تو بُرے انسان ہیں
اُس خُدائے دو جہاں کے کتنے نافرمان ہیں

پھر بھی لیکن جس طرح وہ معاف کرتا ہے ہمیں
کاش چھوٹوں کو یونہی ہم معاف اپنے کر سکیں

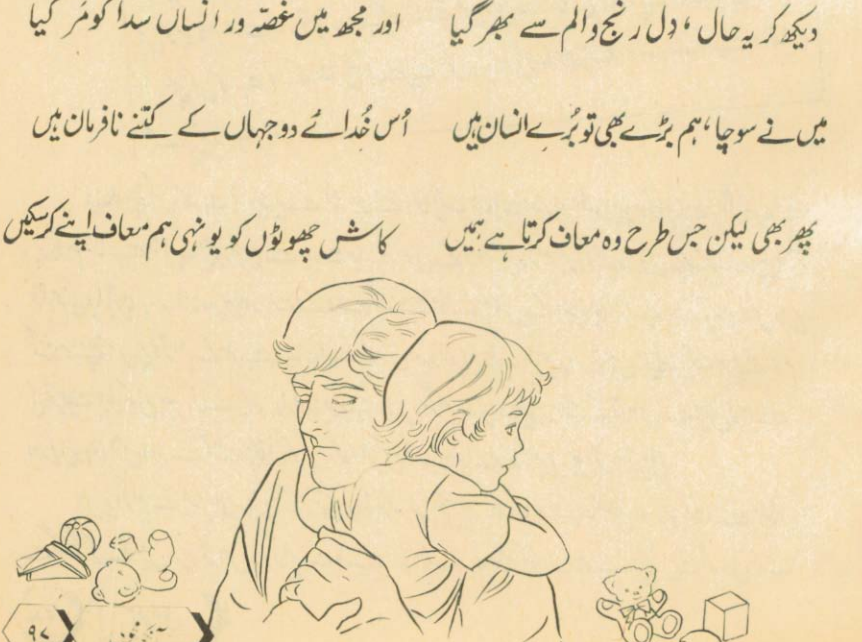

# یہ بچّہ کس کا ہے؟

ملاقات :- حنیف سحر

محمد نقی صاحب ۱۹۷۱ء سے ریڈیو پر ملازم ہیں اور آج کل سینئر پروڈیوسر کی حیثیت سے اپنی ذمّے داریاں پوری کر رہے ہیں۔ نقی صاحب عموماً سماجی نوعیت کے پروگرام کرتے ہیں لیکن ان کی خاص دلچسپی نوجوانوں سے متعلق پروگراموں کو کرنے میں ہے۔ وہ زیادہ تر اسپورٹس اور نوجوانوں کی دلچسپی مسائل سے متعلق پروگراموں کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن "یہ بچّہ کس کا ہے؟" کو بھی وہ پوری توجّہ اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جو کام محنت اور توجّہ سے کیے جاتے ہیں۔ اُن کے نتائج بھی اچھّے نکلتے ہیں۔ تبھی تو "یہ بچّہ کس کا ہے؟" کے نتائج اتنے اچھے نکل رہے ہیں کہ بچھڑے ہوئے بچّے اپنے والدین تک پہنچ رہے ہیں۔

"یہ بچّہ کس کا ہے؟" ریڈیو سے نشر ہونے والا ایک نہایت مفید اور مقبول پروگرام ہے۔ اگر آپ نے پروگرام سُنا ہے تو آپ اچھّی طرح سے یہ بات جانتے ہوں گے کہ اس پروگرام میں گمشدہ بچّوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ روزانہ دوپہر اور رات کے وقت کھوئے ہوئے بچّوں کے انٹرویو نشر کیے جاتے ہیں۔ اس طرح گمشدہ بچّے اس پروگرام کے ذریعے اپنے اپنے گھروں اور والدین تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے نیک اور اچھے کام کی تعریف بھلا کون نہیں کرے گا۔ ہمارا ریڈیو یہ بامقصد پروگرام ایدھی ویلفیئر سینٹر کے تعاون سے پیش کرتا ہے۔ اور یوں یہ دونوں ادارے گمشدہ بچّوں کو اُن کے والدین تک پہنچانے کا کام مل جُل کر کرتے ہیں۔

اس پروگرام کے میزبان ریڈیو کے سینئر پروڈیوسر محمد نقی ہیں جو نہایت بے تکلّفی اور ذہانت سے بچّوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ چونکہ اس پروگرام کے ذریعے اب تک بے شمار کھوئے ہوئے بچّے اپنے گھروں تک

پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے ہمارا جی چاہا کہ آنکھ مچولی کے ساتھیوں کی ملاقات محمد نقی سے کرائی جائے اور پروگرام کے متعلق ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو اس سے پہلے ساتھیوں کے علم میں نہ آئی ہوں۔ محمد نقی سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے اُن سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

نقی صاحب یہ بتائیے کہ اس پروگرام کا آئیڈیا کس کا ہے اور اسے پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔؟

آپ کو معلوم ہے کہ ریڈیو پہ ایک طویل عرصے سے بچّوں کی گمشدگی کے اعلانات نشر کیے جاتے تھے۔ ہُوا یوں کہ ہمارے پاس ویلفیئر سینٹر والوں کی طرف سے بھیجے گئے گمشدہ بچّوں کے اعلانات بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ ایک روز میں اور میری بیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی (عفّت نقی) ریڈیو پر ہی کام کرتی ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جانا چاہیے۔ سو ہمارے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا کہ اس طرح کا ایک پروگرام باقاعدہ شروع کیا جائے اور اس میں بچّوں کے انٹرویوز بھی سنوائے جائیں۔ جس سے بچّوں کو اپنے گھر والوں تک پہنچنے میں زیادہ مدد مل سکے گی۔ اس آئیڈیا کو ہم نے اپنے مرکز یعنی اسلام آباد بھیجا۔ انھوں نے منظور کر لیا اور یوں یہ پروگرام شروع ہو گیا۔ جہاں تک ضرورت کی بات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اعلانات کی تعداد زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یہ ضرورت محسوس کی گئی اور اس ضرورت کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

آپ نے جو پہلا پروگرام تیار کیا تھا اس کے بعد سے اب تک پروگرام میں کیا تبدیلی ہوئی ہے؟

شروع میں ہم نے بچّے سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کی تھیں اور ایسی بحث اور جرح بھی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کچھ ادھوری ادھوری سی بات لگتی تھی۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے وہ ایک نغمہ پروگرام میں سے نکال دیا جو ابتداء میں سُنایا جاتا تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ بچّے ہی سے سوالات کرنا شروع کر دیئے مثلاً پہلے ہم صرف والدین یا رشتے داروں کے بارے میں پوچھتے تھے اب مزید رشتے داروں کے علاوہ اسکول، مدرسے اور آس پاس کی بہت سی دیگر چیزوں کے بارے میں بھی سوالات کا اضافہ کر دیا۔

اب تک کتنے بچّوں کا تعارف سنوایا جا چکا ہے؟

"دو سو تین بچّوں کے انٹرویوز نشر کیے جا چکے ہیں۔ جن میں سے ایک سو ساٹھ بچّے اپنے والدین تک پہنچ چکے ہیں اور جو بچّے نہیں پہنچے ہیں اُن کا تعارف بھی ہم ہر ایک مہینے بعد دوبارہ نشر کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی اپنے گھر پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں ہم یہ بھی کرتے ہیں کہ پروگرام کو رات میں اور پھر دن میں بھی دوبارہ نشر کرتے ہیں تاکہ جو لوگ رات میں نہ سُن سکے ہوں وہ دن میں سُن لیں۔"

آپ بتائیں گے کہ عموماً کس قسم کے حالات کی وجہ سے بچّے گُم ہو جاتے ہیں؟

زیادہ تر تو وہ بچے ہوتے ہیں جو گھروں سے بھاگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو غربت اور بچے کا محنت مزدوری کرنا ہے اور دوسرا سبب والدین کا بے جا روک ٹوک، زیادتی مار پٹائی تیسرا سبب سوتیلے ماں باپ کا ہونا یا ماں کا نہ ہونا زیادہ تکلیف دہ ہے اور چوتھا سبب مدرسے میں سختی اور بہت زیادہ پٹائی اور استاد کا خوف ہوتا ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر بچے گھروں سے بھاگ کھڑے

ہوتے ہیں۔"

ایسی صورت میں تو وہ واپس گھر جانے پر بھی تیار نہیں ہوتے ہوں گے اور ان کی کوشش ہوتی ہوگی کہ وہ آپ کو غلط سلط معلومات بہم پہنچائیں؟

جی ہاں اُن کی تو ساری کوشش یہی ہوتی ہے لیکن ہم اتنی احتیاط سے اور اس انداز سے سوالات کرتے ہیں کہ وہ کہیں نہ کہیں سچ بول ہی پڑتے ہیں اس طرح ایک سرا ہاتھ آجاتا ہے اور پھر اصل حقائق تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

یہاں میں آپ سے ایک بات اور یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا وجہ ہے۔ امیر گھرانوں کے بچے گھروں سے نہیں بھاگتے جب کہ کوئی نہ کوئی محرومی تو انہیں بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً والدین کی عدم توجہی کا وہ شکار ہوسکتے ہیں۔

نہیں جی امیر گھرانوں کے بچے اس وجہ سے گھر سے تو نہیں بھاگ سکتے۔ کیونکہ غریب گھرانوں کے جو بچے گھروں سے بھاگتے نہیں اس کے اسباب یہ تو نہیں ہوتے نا۔ امیر گھروں میں اگر بچے کو ماں باپ کی محبت کم مل رہی ہے تو نوکر چاکر اس کی دیکھ بھال کرنے والے ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں وہ گھروں سے بھاگنے کی بات نہیں سوچ سکتے۔ کیونکہ جن زیادتیوں اور مصائب کی وجہ سے غریب بچے بھاگتے ہیں۔ ان کا مقابلہ امیر بچوں کے مسائل سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بالکل الگ بات ہے۔ کم ازکم امیر بچوں کو گھر اسکول یا کہیں بھی مار کٹائی کا تو سامنا نہیں کرنا پڑتا ۔ یہ بہت بڑا تحفظ ہے۔ اُن کے پاس میرے خیال سے غریب اور امیر بچوں کے مسائل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

آپ کے جوابات سے ایک بات یہ سامنے آئی ہے کہ غریب بچوں کے گھر سے بھاگنے میں ماں باپ کی بے توجہی اور زیادتیاں بھی شامل ہیں۔؟

جی ہاں پہلی بات تو یہ ہے اور دوسری بات اُن کا وہ ماحول ہوتا ہے جہاں سے اُنھیں اس قسم کی ترغیبات اور سوچ ملتی ہے یہ دونوں باتیں اُنھیں گھروں سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔

زیادہ تر بچوں کا تعلق پاکستان کے کس علاقے یا صوبے سے ہوتا ہے؟

پنجاب سب سے بڑا صوبہ ہے زیادہ تر بچوں کا تعلق بھی وہیں سے ہوتا ہے۔

کچھ ایسے بچے بھی آپ کے علم میں آئے ہیں جو کسی اور وجہ سے گھر چھوڑ کر آگئے ہوں؟

ہاں کچھ معاملات ایسے بھی سامنے آئے ہیں جن میں کام کرنے والے بچے ہیں۔ مثلاً وہ دس روپے روز کما کر لاتے ہیں۔ باپ اُنھیں مارتا بھی ہے اور وہ دس روپے بھی لے لیتا ہے۔ ایسے میں کراچی کے بارے

ہیں جو اس طرح کے علاقوں میں تصور پایا جاتا ہے کہ وہاں بہت پیسہ ہے بہت اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں۔ تو ایسے بچے اس طرح کی سوچ لے کر بھی کراچی آجاتے ہیں۔

آپ پروگرام میں صرف انٹرویوز سنواتے ہیں یا بچوں کو سبق آموز باتیں بھی سمجھاتے ھیں؟

ہم نہ صرف سبق آموز باتیں ہر پروگرام میں سنواتے ہیں بلکہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کو بڑی سے بڑی صورتِ حال کا بھی مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں۔

آپ نے بتایا ھے کہ زیادہ تر بچوں کا تعلق پنجاب کے غریب علاقوں سے ھوتا ھے۔ کبھی کراچی سے بھی کوئی بچہ آپ تک پہنچا ھے؟

جی ہاں لیکن ایک دو نہیں ایسے کئی کیس سامنے آئے ہیں مگر وہ بچے بھاگے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ گم ہوئے ہوتے ہیں یعنی کسی پروگرام یا شاپنگ کرنے یا اسپتال وغیرہ اپنی ماں کے ساتھ گئے اور گم ہوگئے۔ وہ بچے تو اپنے والدین کے پاس جانے کے لیے بہت بے چین بھی ہوتے ہیں اور جھوٹ بھی نہیں بولتے۔

پہلی مرتبہ جب آپ نے کسی بچے کو اپنے والدین سے ملتے ھوئے دیکھا تو اس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے؟

بچوں کے والدین ایدھی سینٹر سے اپنے بچوں کو لے کر جاتے ہیں لیکن ایک دو بار میں نے بھی وہ مناظر دیکھے ہیں۔ انتہائی جذباتی اور رقت آمیز مناظر ہوتے ہیں جنہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے بے حد خوشی بھی ہوتی ہے کہ ایک انسان کی زندگی اور مستقبل تباہ ہونے سے بچ جاتا ہے۔

اسی ضمن میں معذور بچے بھی آپ تک پہنچتے ھیں؟

ہم معذور بچوں کے بارے میں اعلانات کر دیتے ہیں اور اُن کی تفصیلی شناخت بتا دیتے ہیں۔ لیکن ایسا ذہنی طور پر معذور اور گونگے بچوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ ٹانگ سے یا آنکھوں سے معذور بچوں کو تو انٹرویوز میں لایا جا سکتا ہے لیکن اب تک ہمارے پاس معذور بچے آئے نہیں ہیں۔

بچے ایدھی سینٹر تک کس طرح پہنچتے ھیں؟

اس کے کئی طریقے ہیں۔ یا تو تھانے والے پہنچا جاتے ہیں۔ کوئی بچہ انہیں کہیں رات بے رات سوتا ہوا مل گیا ہے یا اسٹیشن پر ملا ہے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لوگ خود پولیس اسٹیشن چھوڑ جاتے ہیں اور بعض دفعہ ایدھی والوں کو خود بھی ایسے بچے مل جاتے ہیں۔

نقی صاحب پروگرام کے فائدے اور اھمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا آپ نے اس طرح

کا کوئی پروگرام یا اس پروگرام میں ایسی کوئی تبدیلی کی ہے جس سے ان اسباب کے خاتمے میں مدد ملتی ہو جس سے ایسے حالات و واقعات پیدا ہوتے ہیں ۔؟

جی ہاں اس ضمن میں ہم والدین کے لیے نفسیاتی ماہرین کو بلا کر اکثر پروگرام کرتے ہیں جو والدین کو ان کی ذمّے داریاں اور بچّے کی دیکھ بھال سے لے کر پرورش تک کے تمام معاملات کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اَن پڑھ والدین کو بھی مختلف طریقوں سے ان مخدوش اور بُرے حالات کے بارے میں سمجھایا جاتا ہے۔ جن سے اُن کا بچہ دوچار ہوسکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس پروگرام کے اچھّے نتائج نکل رہے ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ پروگرام قومی نشریاتی رابطے پر نشر کیا جاتا ہے لیکن کیا ایسا کوئی انتظام بھی کیا گیا ہے جس سے دوسرے شہروں میں پائے جانے والے ایسے بچے وہاں کے فلاحی اداروں کی مدد سے ریڈیو پر لائے جاسکتے ہوں ؟

تمام بڑے بڑے شہروں سے یہ پروگرام نشر ہوتا ہے اور وہاں کے فلاحی ادارے اس ضمن میں معاونت کرتے ہیں لیکن زیادہ کردار ایدھی ویلفیئر سینٹر ہی کا ہے ۔

کوئی ایسا واقعہ آپ سُنا سکیں گے جس سے دوسرے بچے بھی سبق حاصل کرسکیں ۔ ؟

اس وقت تو میں صرف یہ کہوں گا کہ گھر سے بھاگنا کسی طرح بھی اچھّا فعل نہیں ہے ۔ اس کے ہر صورت میں بُرے نتائج نکلتے ہیں

ایک بچہ تھا مجھے اس وقت اُس کا نام یاد نہیں آرہا ہے وہ اچھی نوکری اور اچھے خوابوں کی تلاش میں یہاں کراچی آیا تھا لیکن یہاں اُس نے جس گھر میں نوکری کی وہاں بھی اُس کے ساتھ بے حد ظلم کیا جاتا تھا۔ اس لیے وہ وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا ۔ اور اس طرح در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ ایدھی سینٹر تک پہنچا اور اس کے بعد ریڈیو سے اُس کا انٹرویو نشر ہوا ۔ اس ضمن میں میں ایسے لوگوں سے بھی درخواست کروں گا ۔ جن کے گھروں میں بچے ملازم ہوتے ہیں وہ بچّوں کے ساتھ ظلم و زیادتی والا رویّہ نہ رکھیں ۔ اس طرح بچہ زیادہ بڑی مشکلات کا شکار ہوسکتا ہے ۔

آپ کے اس پروگرام میں لڑکیوں کے انٹرویوز بھی سنوائے گئے ہیں ؟

جی نہیں ! اب تک تو نہیں سنوایا گیا ۔ ایدھی سینٹر والوں کا کہنا ہے کہ پہلے سب لڑکوں کے انٹرویوز ہو جائیں پھر لڑکیوں کا سلسلہ شروع کریں گے کیونکہ وہ زیادہ ذمّے داری والا کام ہے اور لڑکیوں کو رشتے داروں کو بھی نہیں دیا جائے گا بلکہ صرف والدین ہی ان کو یہاں سے لے جاسکیں ۔ یوں تو ہم لڑکوں کو بھی صرف والدین ہی کے حوالے کرتے ہیں ۔ ماموں، چچا یا کسی رشتے دار کو ہم بچہ نہیں دیتے لیکن لڑکیوں کے معاملے

میں زیادہ محتاط رویّہ رکھا جائے گا۔

اس کا مطلب ہے لڑکیاں بھی ایدھی سینٹر والوں کے پاس ہیں۔؟

جی ہاں۔

کتنی عمر کے بچے اب تک آپ کے پاس پہنچے ہیں۔؟

زیادہ سے زیادہ بارہ سال تک

اچھا نقی صاحب ایک بات یہ بتائیے کہ کیا اس پروگرام کو ٹیلی وژن سے دکھائے جانے کا آپ مشورہ دیں گے؟

جی بالکل اس کے تو اور زیادہ اچھے نتائج نکلیں گے کیونکہ اس طرح بچے کو تمام لوگ دیکھ بھی سکیں گے۔ اس طرح تو کوئی بھی شخص دیکھ کر بچے کے وارثوں تک اطّلاع پہنچا سکتا ہے جبکہ ریڈیو پر وہ بات بہرحال نہیں ہوتی جو ٹی وی پیدا کر سکتا ہے۔ انصار برنی ٹرسٹ نے ٹی وی پر اعلانات کا سلسلہ شروع تو کیا ہے لیکن اگر اس پروگرام کو ٹی وی پر دکھایا جا سکے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی

آپ جب انٹرویو سنواتے ہیں تو عموماً کتنے عرصے کے اندر بچے کے گھر والے آپ سے رابطہ قائم کرتے ہیں؟

زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں۔ ورنہ اکثر تو اُسی وقت فون آجاتا ہے یا کسی بھی ذریعے سے وہ ہم سے رابطہ کر لیتے ہیں۔

نقی صاحب اس پروگرام کو پیش کرتے ہوئے آپ کے کیا احساسات و تاثرات ہیں؟

میں بہت طمانیت اور ذہنی سکون محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ذریعے ایک ایسا حساس کام انجام پا رہا ہے اور اس وقت مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی جب میرے بچوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ابو آپ لوگ تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے جیسا ان بچوں کے ساتھ ہوتا ہے، جن کے آپ انٹرویوز سنواتے ہیں۔

کتنے بچے ہیں آپ کے؟

میرے دو بچے ہیں۔

اس کا مطلب ہے وہ آپ کا پروگرام سنتے ہیں؟

ہاں لیکن اس لیے نہیں سنتے کہ وہ پروگرام ان کے ابو کا ہے بلکہ اس لیے سنتے ہیں کہ بچوں کو بچوں سے فطری طور پر خاص ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اس ہمدردی کے تحت ان بچوں کی باتیں سنتے ہیں جو اپنے گھروں اور والدین سے بچھڑ گئے ہوتے ہیں۔

# وہ ایک لڈّو

حاطب صدّیقی

وہ ایک لڈّو
جو اک رکابی کے بیچ اکیلا پڑا ہُوا ہے
بہت اکیلا!
ملُول،
افسردہ،
غمزدہ ہے!
دِل اُس کا بے حد دُکھا ہُوا ہے!
شدید احساسِ کمتری میں بھی مُبتلا ہے،
یہ سوچتا ہے
کسی بھی مہمان نے مجھے کیوں نہ منہ لگایا۔
ذرا چکھا، نہ اُٹھا کے کھایا
میں ایسا اِک بدنصیب لڈّو،
مِلا نہ جس کو کسی بھی مہمان کا پیار اب تک
جو اِک رکابی کے بیچ ہے بے قرار اب تک
مگر اے لڈّو —— عزیز لڈّو!
اے میرے پیارے لذیذ لڈّو!
میں تجھ کو یوں غم نہ سہنے دوں گا،
مزید احساسِ کمتری میں... چَپڑ چَپڑ ہپ... نہ رہنے دوں گا۔

# جادو کی گھڑی

رابعہ تسلیم، گل بہار، کراچی

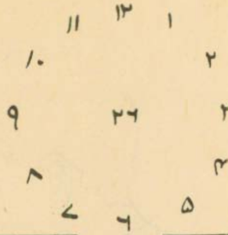


اس گھڑی میں دو حاشیے اس طرح کھینچیں کہ حاشیوں کے درمیان جو گھڑی کے ہندسے آئیں انھیں جمع کریں جواب ۲۶، ہو۔

(جواب اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

# نئی ڈکشنری

## دائیں سے بائیں پڑھیے

"ب" کار وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے

"پ" دائشی ٹیکے ضرور لگوانا چاہئیں

"ت۔ر" گھر کے سامنے میرا گھر ہے.

"چ" لا شیطان کا!

"ح" رانی کی بات ہے۔

"د" اور چاول آج پکیں گے۔

"ڈ" پر طوطا بیٹھا ہے۔

"ر" کارڈ قائم ہوگیا۔

"س" ڈرامے کا بہت اچھا تھا

"ک" فی پینے کو دل چاہتا ہے۔

"ہ" گا اور آلکل سرگم

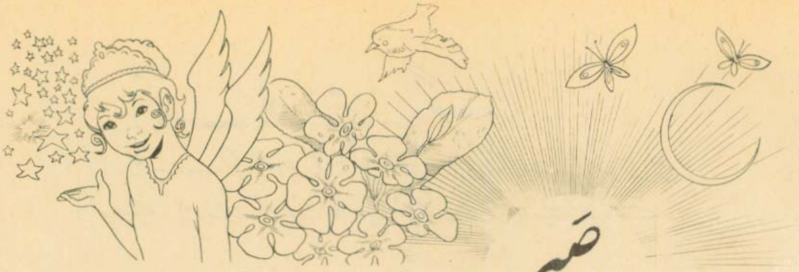

# صَبر

(ننّھے بچّوں کے لیے ایک نظم)

شبّیر بیگ نازؔ

صبر کا پھل ہوتا ہے میٹھا
یہ جمُلہ ہے کتنا اچھّا

جتنا اِس پر غور کروگے
عمل اُتنا ہی اور کروگے

ناحق ہی جب کوئی ستائے
خواہ مخواہ اُوپر چڑھتا آئے

ہرگز اِس کے منہٗ نہ لگو تم
کام ہمیشہ صَبر سے لو تم

ڈالا ہو جب روگ نے ڈیرا
یا ہو تنگدستی نے گھیرا!

فاقے گھِر گھِر کر آتے ہوں
رِشتہ دار بھی کتراتے ہوں

پھُول سے بچّے دُودھ کو ترسیں
غم کے بادل ٹوٹ کے برسیں

پھر بھی صَبر سے کام جو لے گا
سچّا صا.بر بَن کے رہے گا

اللہ اُس کی مَدد کرے گا
خوشیوں سے دامن بھر دے گا

# رنگ بھریئے ... مگر

رنگ بھرنے سے قبل تصویر کے نامکمّل حصّوں کو بڑی نفاست کے ساتھ مکمّل کر لیجیے۔ پھر رنگ بھریے اور دیکھئے اس صفحے کا حُسن کیسے نکھرتا ہے۔

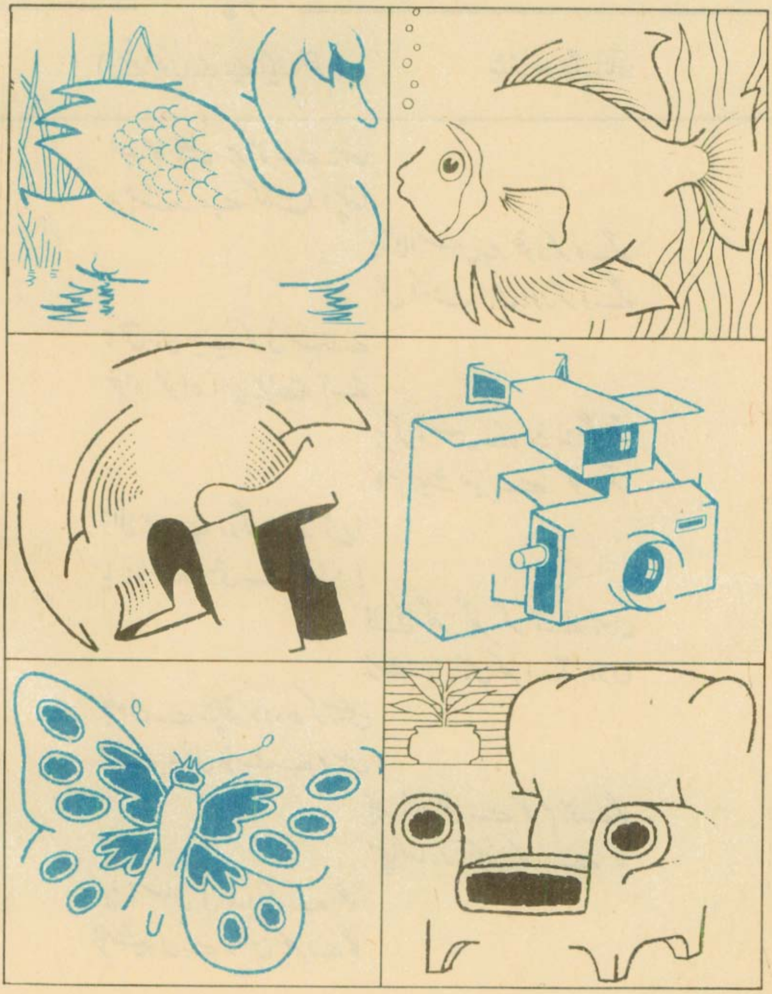

# اندھی دنیا

نیکی کی تلقین سب کرتے تھے نیکی کرنے کے لیے کوئی تیاّر نہ تھا

عامر یونس

"کچھ بھی کرو... مجھے پریشان مت کرو... جاؤ باہر جاؤ..."

فیصل آنکھوں میں موتی جیسے آنسو جھلملاتا ہوا گھر سے باہر آگیا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور بادل بھی آسمان پر آرہے تھے۔ شاندار موسم تھا اور ایسے میں گھومنے کا لُطف اور بھی دوبالا ہو جاتا، مگر... وہ کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ امّی نے بڑے بھائی کو اس کے ساتھ سیر پر جانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اور ایسی صورت میں کس طرح جاتا... اس کے ساتھ جانے والا کوئی تھا ہی نہیں، اور پھر یہ صرف آج ہی تھوڑی ہوا تھا۔ ابّا کی وفات کے بعد سے جب تمام ذمّے داری اس کے بڑے بھائی

پر آگئی تھی۔اس کے بعد سے اُن کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ فیصل کو گھمانے پھرانے لے جائیں۔

فیصل سوچ رہا تھا۔حقیقتاً وہ بہت افسردہ تھا۔اچانک اُس نے مُڑ کے دیکھا۔اس کے پیچھے ایک بوڑھا آدمی کھڑا تھا۔یہ دلشاد بابا تھے۔

"بابا آپ کو کچھ بھی نظر نہیں آتا...؟" وہ بھاگ کے بابا کے پاس پہنچا اور پوچھ بیٹھا۔

"ہاں بیٹا...مجھے کچھ نظر نہیں آتا...۔" دلشاد بابا ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

"میرا مطلب ہے آپ کو...کیا...محسوس ہوتا ہے...؟"

"آنکھیں بند کرو...۔" بابا نے کہا۔فیصل نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا نظر آیا؟" "کچھ بھی نہیں...بس اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"بس بیٹا...ہمیں بھی یہی اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔" دلشاد بابا نے فیصل کو سمجھایا۔

"آپ کو اس اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا...؟" فیصل نے پوچھا تو دلشاد بابا ہنس پڑے۔

"نہیں بیٹا...اس اندھیرے سے کیا ڈرنا...یہ تو ہمارا ساتھی ہے۔"

"بابا...آپ کا گھر بھی تو ہوگا...آپ کے بچے بھی تو ہوں گے...؟"

"ہاں بیٹا...میرا گھر قریب ہی ہے...اور اس گھر میں میرا بیٹا اور اس کی بیوی اور ایک ننھا سا پوتا بھی ہے۔مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنے پوتے کو نہیں دیکھ سکا ہوں۔پتا ہے فیصل...میری آنکھیں پانچ سال پہلے بالکل ٹھیک تھیں...پھر پتا نہیں کس طرح۔میری آنکھوں میں موتیا ہو گیا۔یہ موتیا ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے جس کی وجہ سے آنکھ خراب ہو جاتی ہے۔ٹھیک نظر نہیں آتا۔میں اس وقت کلرک تھا۔چند سو روپے تنخواہ تھی۔اس میں سے مجھے اپنے بیٹے کی پڑھائی پر بھی خرچ کرنا ہوتا تھا۔بس میں بروقت علاج نہ کرا سکا۔تھوڑے عرصے بعد میں بالکل اندھا ہو گیا۔میری نوکری بھی چھُٹ گئی اور ساتھ ہی میرے بیٹے کی پڑھائی۔میرے بیٹے نے میرے علاج کی پوری کوشش کی۔یہاں تک کہ ایک فلاحی ادارے کی مدد سے موتیا کا آپریشن بھی کروا دیا۔مگر پتا چلا کہ میری آنکھ کے قرنیے کو نقصان پہنچ چکا تھا۔اس کی تبدیلی لازمی تھی اور اس کے لیے جو آپریشن ہونا تھا وہ تو ہماری دسترس سے دُور تھا۔اس کے بعد میں گھر بیٹھ گیا۔اور میرا بیٹا کام کرنے نکل گیا۔اب وہ نوکری کرتا ہے،اور شادی کے بعد اب اس کا بھی ایک بچہ ہو گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی پال رہا ہے۔بالکل میرے پوتے کی طرح۔وہ بھی ابھی کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے اور میں بھی...۔" دلشاد بابا کی آواز بھرّا گئی۔"کاش میں مرنے سے پہلے اپنے پوتے کی شکل دیکھ سکتا۔دلشاد بابا کو دیکھ کر فیصل کی آنکھ میں بھی آنسو آ گئے۔

اس رات فیصل کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ بار بار اس کے کانوں میں دلشاد بابا کے الفاظ گونجنے لگتے: "کاش ... میں مرنے سے پہلے اپنے پوتے کی شکل دیکھ سکتا۔ پھر اُس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ یونہی سوچتے سوچتے بالآخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح فیصل جلد ہی اُٹھ بیٹھا... رات سوتے میں اس کو ایک خواب دکھائی دیا تھا۔ جس میں وہ مختلف لوگوں سے چندہ مانگ رہا تھا اور پھر اُس نے دلشاد بابا کو مُسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور اب فیصل نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"امّی... مجھے پیسوں کی ضرورت ہے" فیصل نے ناشتے کی میز پر کہا۔

"کیا مطلب... ایسی کیا ضرورت آپڑی؟"

"آپ کہتی ہیں نا کہ بڑوں کی مدد کرنی چاہیے... ان سے اچھی طرح پیش آنا چاہیے..."

"ہاں بھئی صاف صاف بات کرو، اور جلدی کرو۔ تمہیں اسکول میں دیر ہو جائے گی"

"وہ مجھے دراصل کسی کے لیے... مجھے کسی کی آنکھیں ٹھیک کروانی ہیں..." فیصل نے کہہ ہی دیا۔

"کیا کہا... آنکھیں ٹھیک کروانی ہیں... اور تمہیں..." امّی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں... بس آپ مجھے پیسے دے دیں" فیصل نے کہا۔

"عجیب باتیں کر رہا ہے یہ لڑکا... اچھا خیر یہ بیس روپے لے لو... اس سے زیادہ تو میں دے ہی نہیں سکتی... اور ہاں... ان کو کسی اور چیز میں مت خرچ کرنا"

"بہت شکریہ امّی..." فیصل نے خوشی خوشی روپے پکڑ لیے۔

اسکول میں فیصل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کلاس چھوڑ کر اسکول کے تمام ٹیچرز اور لڑکوں سے چندہ مانگنا شروع کر دے۔ وہ ایک بڑی ذمّے داری محسوس کر رہا تھا اور اس بات کی بھی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اس مشن کا کوئی اور بھی راز دار ہو۔ اور ایسا شخص اس کا سب سے عزیز دوست انوار ہی ہو سکتا تھا۔

"انوار... مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے" فیصل نے انوار کو آدھی چھٹی میں پکڑ ہی لیا۔

"مم... بولو..." انوار سموسہ چباتا ہوا بولا۔ "ایک بہت ضروری کام ہے..."

"بھئی ضروری کام ہے تو جلدی بتاؤ" اور فیصل نے انوار کو تمام رام کہانی سُنادی۔

"کیسی بات کر رہے ہو... بھلا ہم بچّے اتنا بڑا کام کس طرح کر سکتے ہیں... تم ہمیشہ بے تُکی ہی سوچتے ہو"

"کیا...؟" فیصل کو انوار سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ "ٹھیک ہے پھر خدا حافظ..."

"ارے ... فیصل ... سنو ... بات توسنو ..." انوار ناراض فیصل کے پیچھے لپکا مگر فیصل دُور بھاگ چکا تھا۔

انٹرکام کی گھنٹی بجنے پر اسکول کے پرنسپل صغیر صاحب نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔

"کیا بات ہے ...؟"

"سر چھٹی جماعت کا ایک لڑکا فیصل آپ سے ملنا چاہتا ہے" ان کے پی اے نے وجہ بتائی۔

"اچھا بھیج دو"۔ تھوڑی دیر بعد ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ ..." پرنسپل صغیر صاحب نے کہا اور فیصل اندر داخل ہوگیا۔

"بولو ... کیا کام ہے ...؟" صغیر صاحب نے کہا۔ فیصل نے اپنی تمام ہمت جمع کی۔

"وہ سر ... السلام علیکم ..." اس کی سمجھ سے بات بالاتر تھی کہ گفتگو کس طرح شروع کی جائے۔

"وعلیکم السلام ... ہاں کہو ..." "وہ سر ... میں چندہ لینے آیا ہوں ..." فیصل نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

"چندہ لینے ... مگر کس سلسلے میں ..." صغیر صاحب حیران ہو کر بولے۔

"دراصل ایک بزرگ ہیں اُن کی آنکھیں خراب ہیں ... ان کا آپریشن کروانے کے لیے میں چندہ جمع کر رہا ہوں"۔

"کیا ...؟" صغیر صاحب چلا اُٹھے "یہ فضول بات کرنے کے لیے میرا ٹائم ضائع کیا ... ہننہ ... یہ لو پانچ روپے ... اور گیٹ آؤٹ ..." فیصل نے پانچ روپے تھامے اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ پرنسپل کے دفتر سے باہر نکل کر وہ اسکول کے باغ میں جاکر بیٹھ گیا۔ چھٹی ہوچکی تھی اور اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ فیصل نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور جمع شدہ روپے باہر نکال لیے۔ پچیس روپے اس کا منہ چڑانے لگے۔ جبکہ اسکول لگنے سے اس وقت تک وہ دس کے قریب لوگوں سے بات کرچکا تھا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں فیصل نے سوچا ہوا تھا کہ وہ اس کی ضرور مدد کریں گے۔ ان میں سے صرف اُس کی امی نے بیس روپے اور پرنسپل صاحب نے پانچ روپے دیئے تھے۔ اس کے دوست انوار نے بھی اس کو کھرا جواب دے دیا تھا۔ اور اس کو پڑھانے والے تمام ٹیچرز نے بھی۔ حتیٰ کہ اسلامیات کے ٹیچر احسان اللہ صاحب نے بھی فیصل کو ٹال دیا تھا۔ جو ہر وقت اُن کو اچھائی کا درس دیتے رہتے تھے۔ وہ اپنی ہر کلاس کے شروع میں اخلاقیات پر ایک لیکچر دیا کرتے تھے: "ہمیں چاہیے کہ اپنے بڑوں کی اپنے استادوں کی عزت کریں ان کا کہا مانیں۔ ان کے کام آئیں اور اچھے اچھے کام کریں اس سے نہ صرف والدین اساتذہ اور بزرگ خوش ہوتے ہیں بلکہ اللہ بھی خوش ہوتا ہے ..." ان کے یہ الفاظ اب فیصل کو بالکل کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسے ہی جیسا کہ کوئی طوطا کسی جملے کو رٹ کر بولتا رہتا ہے۔ وہ کافی دیر تک بیٹھا

سوچتا رہا… کڑھتا رہا۔ پھر باغ کے مالی نے آکر اُس کو اُٹھا دیا۔۔ فیصل اسکول سے باہر نکل آیا۔ آج اس کا ارادہ گھر جانے کا نہیں تھا۔ ہاں اُس نے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جو نکلنا تھا۔

اسکول سے قریب ہی بڑی بڑی کوٹھیوں والا محلّہ تھا۔ فیصل نے ان کوٹھیوں سے چندہ جمع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلی کوٹھی میں وہ دس منٹ تک گھنٹی بجاتا رہا مگر نہ کوئی آواز آئی اور نہ کوئی انسان۔ دوسری کوٹھی میں گھنٹی بجاتے ہی کتے اس پر بھونکنے لگے اور ڈر کے مارے فیصل گلی کے دوسرے سرے تک بھاگتا چلا گیا۔ تیسرے مکان سے ایک نوکر نکلا اور چندے کا سنتے ہی اس نے اس زور سے دروازہ بند کیا گویا فیصل کو تھپڑ مار رہا ہو۔ یونہی فیصل کوٹھی سے کوٹھی پھرتا رہا۔ مگر کچھ نہ ہو سکا۔ شام کے سائے کے ساتھ ساتھ اُس کے عزائم بھی ڈھلتے جا رہے تھے۔ اور رات کی تاریکی کے ساتھ ساتھ مایوسی کی اندھیری رات بھی پھیلتی جا رہی تھی۔۔

جب وہ گھر پہنچا تو گھر میں سب پریشان تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے:" اس کی امّی نے ہلکے سے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں چندہ جمع کر رہا تھا" فیصل نے تھکے ہوئے لہجے میں بستہ اُتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا کتنا ہو گیا…؟" امّی نے پوچھا

"تیس روپے…" فیصل نے بتایا، امّی حیرت زدہ رہ گئیں "ہاں امّی جی…: میں سمجھتا تھا کہ جس طرح لوگ اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں، اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی اچھے کام کرتے ہوں گے یا کم از کم اچھے کام کرنے والے کی مدد تو کرتے ہوں گے… مگر مجھے پتا چلا کہ ایسی باتیں کرنے والے سب لوگ چاہے دوست ہوں یا نہ ہوں سب کے سب خود کچھ نہیں کرتے… صرف باتیں ہی کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں… سب جھوٹ بولتے ہیں…" فیصل اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

پھر کئی روز تک فیصل گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ خاصی معقول رہی اور امّی نے بھی اس کو اسکول نہیں جانے دیا۔ فیصل بستر میں پڑا رہتا اور سوچتا رہتا۔ تین روز یونہی گزر گئے جب احساسِ شکست کچھ کم ہوا۔ تو فیصل شام کو گھر سے نکلا۔ اس کا ارادہ دلشاد بابا کے پاس جا کر اعترافِ ناکامی کرنے کا تھا۔ اس طرح اُس کے دل پر سے اُداسی اور مایوسی کی تہہ اُتر جاتی۔

وہ ڈھونڈتا ہوا ان کے گھر پہنچ ہی گیا۔ دروازہ دلشاد بابا کے بیٹے نے کھولا۔

"مجھے دلشاد بابا سے ملنا ہے…" فیصل نے کہا۔

"بابا سے… اور تمہیں… اچھا…" ان کا بیٹا حیران تھا… "آؤ ان کی طبیعت خراب ہے… وہ اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں" فیصل پیچھے چل پڑا۔

"آجاؤ..." بابا کے بیٹے نے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اشارہ کیا۔ فیصل کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے کے ایک کونے میں دلشاد بابا چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔

"بابا کوئی لڑکا تم سے ملنے آیا ہے..." اور اُن کا لڑکا فیصل کو بابا کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

"کون ہے؟" دلشاد بابا نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں بابا... فیصل..." فیصل کے آنسو گر رہے تھے۔

"ارے بیٹا تم..." بابا اس کے آنے کا سُن کر خوش ہوگئے۔

"بابا... اندھا وہ ہوتا ہے نا جو کچھ نہ دیکھ سکے..." فیصل نے پوچھا۔

"ہاں..." دلشاد بابا نے جواب دیا۔

"پھر تو یہ دنیا بھی اندھی ہوئی... پھر تو سب لوگ اندھے ہوئے... کوئی بھی نہ دیکھتا ہے نہ سمجھتا ہے... بابا۔ آپ اندھے نہیں... اندھے تو وہ ہیں جن کے پاس آنکھیں بھی ہیں پھر بھی وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے..." فیصل پھُوٹ پڑا۔

"ارے... تمہیں کیا ہوگیا..." دلشاد بابا حیران رہ گئے۔ شاید ایک بچّے سے وہ ایسی بات سُننے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

"لگتا ہے چند دنوں میں ہی تم خاصے بڑے ہوگئے... ہاں بیٹا تم کہتے تو ٹھیک ہو یہ دُنیا اندھی ہے۔ مگر ابھی اس دنیا کے تمام لوگ اندھے نہیں ہوئے ہیں... ابھی تمہارے جیسے ہزاروں، لاکھوں بچّے موجود ہیں جو دیکھ بھی سکتے ہیں اور سمجھ بھی سکتے ہیں۔ امید مت چھوڑو... تم ہی تو اب ہماری آنکھیں ہو... ان آنکھوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔"

ایک بات یاد رکھنا فیصل... نفرت آسانی سے بانٹی اور پھیلائی جاسکتی ہے... جبکہ محبّت... اس کو بانٹنا اور پھیلانا بہت مشکل کام ہے... اپنے دل میں نفرت مت بھرنا... اس کو محبت کا گھر بنانا اب تم گھر جاؤ تو خوش خوش جانا... سمجھ لو کہ میری تمام خواہشات پوری ہوگئی ہیں..."

فیصل نے بابا کو سلام کیا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد جب فیصل کو دلشاد بابا کے انتقال کی خبر ملی تو وہ نہیں رویا۔

# رہائی

حنا خیری

ایک اُداس کہانی جب امریکہ سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئی تھیں

"جیسی جلدی پلیٹیں دھوؤ۔ دیر نہ کرو۔" مسز پال کی کڑک دار آواز سُن کر جیسی کے ہاتھ تیزی سے پلیٹیں صاف کرنے لگے۔ جیسی نے جب سے آنکھ کھولی تھی اپنے آپ کو اور اپنی ماں کو دوسروں کی غلامی میں ہی زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور دوسری جگہوں پر نیگرو جنہیں کالے لوگ کہا جاتا تھا غلامی کی بدترین زندگی گزار رہے تھے۔ غلاموں کی تجارت عروج پر تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح

کالوں کو ہانکا جاتا ۔ ان کا سودا کیا جاتا ، منہ مانگے دام لگا کر "گورے" بڑی شان سے گردن اونچی کر کے اُنہیں خریدتے اور پھر ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے ۔ صبح سے لے کر رات تک وہ کام میں جُتے رہتے۔ کھانے کو پیٹ بھر کر نہ ملتا ۔ ذرا ذراسی بات پر انھیں رُوئی کی طرح دُھنک دیا جاتا ۔ چھوٹی سی غلطی کی کڑی سے کڑی سزا ملتی اور اس کے ساتھ ساتھ انتہائی تحقیر اور ذلّت آمیز سلوک ان کے ساتھ ہوتا ۔

جیسی نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ پہلے وہ بھی پال کا غلام تھا اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ہی رہتا تھا ۔ مگر پھر جب اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تو پال نے اُسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا ۔ تب سے اُس کا کچھ پتا نہ تھا ۔ جیسی کو یہ سب باتیں اس کی ماں ایلس نے بتائی تھیں ۔ وہ اس کے باپ کو یاد کرتے کرتے آبدیدہ ہو جاتی ۔ جیسی کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی ۔ اس نے اُسے دیکھا تو نہیں تھا لیکن اس کا ایک تصوّر ، ایک شبیہہ ، ایک خاکہ جیسی کے ذہن میں موجود تھا ، وہ تصوّر ہی تصوّر میں خود کو اپنے باپ سے ملتے دیکھتی کبھی دیکھتی کہ وہ اس کی گود میں موجود ہے ۔ اور وہ اسے پیار کر رہا ہے ۔ کبھی دیکھتی کہ وہ اُسے پیٹھ پر لاد کر سواری کر رہا ہے اور کبھی وہ اور اس کی ماں اُس کے ساتھ کھیل رہے ہیں

پال ایک سخت مزاج آدمی تھا اور غصّے کا بہت تیز تھا ۔ ناک پہ مکّھی نہ بیٹھنے دیتا ۔ اس کی بیوی نسبتاً نرم مزاج کی عورت تھی مگر وہ اپنے میاں سے بہت ڈرتی تھی اور اس سے دب کے رہتی تھی ۔ ان کے پاس ایلس اور جیسی کے علاوہ پندرہ بیس غلام اور تھے ۔ جس طرح گائے کا بچہ مالک کی ملکیت ہوتا ہے ۔ اسی طرح جیسی بھی چونکہ غلام کی بیٹی تھی اس لیے ان کی ملکیت تھی ۔ پال ایک امیر آدمی تھا ۔ اس کے پاس زمین تھی ۔ جس پہ وہ کھیتی باڑی کرتا تھا ۔ ایلس گھر کے کام کاج میں صبح سے لے کر رات تک جُتی رہتی ۔ باقی لوگ کھیت پر کام کرتے تھے ۔ صبح سے شام تک وہ گھوڑے گدھوں کی طرح کام کرتے اور اس کے بعد بھی انہیں آرام نہ تھا ۔ کوئی نہ کوئی کام ہر کسی کے لیے ہر وقت تیار رہتا ۔ پال کے پاس کئی اعلیٰ نسل کے خوبصورت گھوڑے تھے ۔ جن کی دیکھ بھال بھی کالوں کے سپرد تھی ۔

جو جتنا امیر ہوتا اتنے ہی زیادہ غلام رکھتا ۔ اس علاقے میں پال ہی سب سے زیادہ امیر آدمی تھا ۔ اور سب سے زیادہ غلام اُسی کے پاس تھے ۔ جیسی نے اپنی ماں کے چہرے پہ کبھی خوشی نہ دیکھی تھی ۔ خود جیسی بھی خوشی کے لفظ سے ناآشنا تھی ۔ اس نے اکثر رات کے تاریک سنّاٹوں میں ماں کی سسکیوں کی آواز سنی تھی ۔ ایلس کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ وہ جیسی کو دیکھتی ، اس کا خیال رکھتی ۔ جیسی تو خودرَو

پودے کی طرح بڑی ہوتی گئی۔ جیسی جب پال کے بچوں ٹونی، مَیری اور ٹام کو دیکھتی تو اس کے دل میں ہُوک سی اُٹھتی۔ وہ سوچتی رہ جاتی۔ بہت سے سوالات اس کے ذہن میں سر اُٹھانے لگتے اور جب وہ بہت دماغ لڑانے پر بھی ان کے جوابات حاصل نہ کر پاتی تو پھر لاچار ہو کر اپنی ماں سے پوچھتی۔

"ماما، مسٹر پال اور یہ سب لوگ ہمارے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ ماما... ٹام ٹونی اور میری میری طرح کام کیوں نہیں کرتے؟ ماما یہ لوگ ہمیں اتنی نفرت اور حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں؟

ماما... میرے پاس میری جیسے کپڑے کیوں نہیں ہیں"؟ ایلس اپنی بیٹی کے چہرے پہ پھیلے محرومیوں کے سائے دیکھتی اور بڑے شکستہ لہجے میں جواب دیتی: "جیسی ہم اور وہ ایک سے نہیں ہیں، ہم کالے ہیں ان کے غلام ہیں۔ وہ ہمارے آقا ہیں"۔

"ماما کیا کالا ہونا بہت بُری بات ہے۔ کیا کالا ہونا گناہ ہے"؟ جیسی معصومیت سے پوچھتی۔

"نہیں جیسی" ایلس اُسے سینے سے لگا لیتی: "کالا ہونا کوئی گناہ نہیں، کوئی بُری بات نہیں ہے مگر یہ گوروں کی دنیا ہے۔ وہ لوگ اپنے آپ کو ہم سے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم سے بہتر، برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ہم کمزور ہیں، وہ طاقتور ہیں۔ طاقت کے بل بوتے پر ہم کو غلام بنایا ہے": جیسی کچھ سمجھتی کچھ نہ سمجھتی، اور چپ چاپ سر جھکا لیتی۔

ٹام، مَیری اور ٹونی جب کچھ کھیلتے تو جیسی باورچی خانہ کے دروازے کی اوٹ سے انھیں دیکھتی رہتی۔ اس کا بھی بڑا جی چاہتا ان کے ساتھ کھیلنے کو۔ ایسے میں اگر کسی کی نظر اس پہ پڑ جاتی تو اُسے فوراً وہاں سے ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا۔ ایلس دن بھر کام کاج میں جُتی رہتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، برتن اور کپڑے دھونا، مویشیوں، گھوڑوں، بطخوں اور مرغیوں کو دانا پانی دینا وغیرہ،

جب سے جیسی کچھ بڑی ہوئی تھی، وہ بھی ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ جب ایلس اُس سے کوئی کام کرنے کو کہتی تو وہ بھاگ بھاگ کر وہ کام کرتی تاکہ اپنی ماں کا کچھ ہاتھ بٹا سکے، اس کے کام آسکے۔ جیسی کے ذمّے بچوں کا کمرہ صاف کرنا ان کے جوتوں کو پالش کرنا اور اسی طرح کے کام تھے۔ کبھی کبھی ترس کھا کر مسز پال، جیسی کو کوئی چیز، کوئی پرانا کھلونا، چاکلیٹ دے بھی دیا کرتیں۔ اسی لیے جیسی کو وہ کچھ کچھ اچھی بھی لگتی تھیں۔ مگر مسٹر پال اور ان کے تینوں بچے تو اُسے ایک آنکھ نہ بھاتے۔ پال بڑا سخت گیر انسان تھا۔ ہر وقت غصے میں بھرا رہتا اور نہ جانے کیوں جیسی کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں۔ ڈانٹ کر اُسے اپنے سامنے سے بھگا دیتا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالتا۔ اور بات بات پر

گالیوں سے نوازتا، اور اُس کے بچے بھی اُس ہی کی طرح تھے۔ خوب رُعب جما کر بات کرتے۔ بات بات پر جیسی کی خوب بے عزّتی کرتے اور اُسے "کالی کلوٹی" کے نام سے پکارتے۔

جیسی کے دل میں ٹھیس سی لگتی۔ اس کا دل بھر آتا۔ آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے، جنہیں وہ کبھی تو پی لیتی اور کبھی کسی کونے میں گھُس کے خوب بہاتی۔ البتہ جب بھی کوئی اس کی ماں کو بُرا بھلا کہتا، تو اس کا خون کھول اُٹھتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اتنی بڑی ہو جائے کہ سب کو سزا دے سکے۔ جو لوگ اس کی ماں پہ ظلم کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کو خوب مارے۔ ایک ایک ظلم کا ایک ایک زیاتی کا خوب بدلہ لے۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد تمام غلام اصطبل میں پڑے گھانس پھونس پہ ایسی مدہوشی کی نیند سوتے کہ اُنہیں اپنی سُدھ بُدھ نہ ہوتی۔ کسی کی ٹانگ کسی کے پیٹ پر اور کسی کا ہاتھ کسی کے منہ پہ ہوتا۔ ایسے میں اگر کوئی زہریلا کیڑا سانپ بچھو بھی اُنہیں کاٹ لیتا تو انھیں مطلق خبر نہ ہوتی۔ جیسی بہت حساس لڑکی تھی۔ ان پہ کیا جانے والا ہر ظلم، ہر زیادتی اُس کے دل پہ نقش تھی۔ اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب اُسے بُخار تھا اور اُس کی ماں نے ماما سے مجبور ہو کر تھوڑا سا دُودھ بلا اجازت جیسی کو پلا دیا تھا۔ تب پتا نہیں کیسے سب کو خبر ہو گئی تھی۔ مسز پال نے ایلس کو خوب بُرا بھلا کہا تھا۔ اور مسٹر پال نے اُس کے بال زور سے کھینچے تھے۔ اور دو زوردار چانٹے لگا کر دھکّا دیا تھا۔ مسز پال نے اُنھیں روکنے کی کوشش کی تھی جس پہ وہ بولے۔

"اس نے چوری کی ہے تو سزا ملنی چاہیے۔ اب آئندہ یہ چوری کرنے سے پہلے ضرور سوچے گی۔"

اُس روز اینڈریو نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر پکڑا گیا اور پھر پال اور اُس کے سیکریٹری جارج نے کوڑے مار مار کر اُسے لہولہان کر دیا۔ دوسرے سارے غلام اور وہ دونوں کام روک کر اینڈریو پہ ظلم ہوتے دیکھتے رہے مگر کسی کو آگے بڑھنے کی یا اُنھیں روکنے کی جرأت نہ ہو سکی اور پھر بے چارہ اینڈریو مَر گیا۔ سِسک سِسک کر مَر گیا۔ وہ لوگ چُپ چاپ اُسے مرتے دیکھتے رہے مگر اُس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس واقعے کے بعد ان کے دلوں میں سفید آقاؤں کے لیے نفرت اور غم و غصہ اور بڑھ گیا۔

جیسی دہشت زدہ سی ہو گئی تھی اور ڈری سہمی رہنے لگی۔ پال کا سامنا کرنے سے وہ کترانے لگی۔ جہاں پال کی صورت دیکھی فوراً دبک جاتی۔ ان دنوں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ جیسی کو صحیح طور سے تو کچھ پتا نہیں تھا۔ لیکن اُسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے ضرور۔ اس نے کئی مرتبہ اپنی ماں اور دوسروں کی گفتگو میں ابراہام لنکن کا نام سُنا اور ایک دن وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

"ماما یہ ابراہام لنکن کون ہے؟"

"ہمارا صدر۔" "آپ لوگ ہر وقت اُن کے بارے میں ہی کیوں باتیں کرتے ہیں؟"
"ابراہام لنکن ہم مظلوموں کے، غلاموں کے ساتھ ہے اور ہماری آزادی کے لیے کوشاں ہے۔ جیسی خدا سے دُعا کرو ہمیں آزادی نصیب ہو جائے۔"

"آزادی ..." جیسی سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے آزادی کا مزا آج تک چکھا ہی نہیں تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو غلامی کی دلدل میں دھنسے دیکھا تھا۔ البتہ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے ماما پاپا کے ساتھ ایک الگ مکان میں رہے۔ جہاں کوئی ان پہ دھونس جمانے والا نہ ہو، کوئی ان پہ ظلم کرنے والا نہ ہو، جہاں وہ خوش و خرّم دوسروں کے ظلم و زیادتی سے دور رہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی میری کی طرح تتلیوں کے پیچھے دوڑے اور پال اور مسز پال کی طرح اُس کے ماما پاپا بھی اُس کے ساتھ کھیلیں۔ پھر جیسی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھا دیے۔

اور پھر آزادی کا چمکتا دمکتا سورج طلوع ہو گیا۔ سارے امریکہ میں غلامی کو غیر قانونی قرار دے کر ختم کر دیا گیا۔ شمالی اور جنوبی ریاستوں کی خوں ریز خانہ جنگی کے بعد شمالی ریاستوں کی فتح ہوئی اور اس طرح ظلم کی زنجیروں کو کاٹ دیا گیا۔ تاریکی اور ظلمت کے بادل چھٹ گئے اور آزادی کی ایک نئی مہکتی تازہ دلفریب صبح خوشیوں اور مسرتوں کے پیغام لیے نمودار ہوئی۔ یہ دن امریکہ کی تاریخ کا ایک یادگار دن تھا۔ ایک یادگار اور سنہرا باب تھا جو ایک نسل کے انسانوں کو انسان کا درجہ دینے آیا تھا۔ آزادی جو ہر انسان کی بنیادی اور اوّلین خواہش ہے۔ جب ملی تو ان کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ جیسی نے اپنی ماں کے چہرے پہ خوشی کے نئے رنگ دیکھے۔ مسرتوں کی قوس و قزح دیکھی۔ سارے کالے خوشی سے چہکنے لگے۔ وہ لوگ بھی اوروں کی طرح اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ منزل کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے خود کو غلام ہی کے روپ میں دیکھتے آئے تھے۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی، جہاں قدم اُن کو لے جا رہے تھے وہیں جا رہے تھے۔ ایلس اور جیسی کے ساتھ انکل البرٹ تھے۔ انکل البرٹ نے ایلس کو بیٹی بنایا ہوا تھا۔ ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جیسی بھی اُن کو نانا کی طرح ہی چاہتی تھی۔ وہ اوروں کی طرح پال کے کھیت پہ کام کرتے تھے۔ اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس لیے زیادہ محنت کا کام کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ مگر اب وہ آزاد تھے، ظلم اور زیادتی سے نجات پا چکے تھے۔ پال کے پاس جتنے غلام تھے سب ایک ساتھ نامعلوم منزل کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں اُن کو اور بیگرو ملتے گئے اور یوں اُن کا قافلہ کافی بڑا ہو گیا۔ آخر کار کئی دنوں کی خاک چھانتے ہوئے وہ لوگ ایک ایسی جگہ

پہنچے، جہاں مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں سے آنے والے بینگرو ایک جگہ جمع تھے اور ایک کیمپ سا قائم ہو گیا تھا۔ کئی دن وہ لوگ وہاں رہے، نہ اُن کے پاس کچھ کھانے کو تھا اور نہ پہننے، اوڑھنے کو غلاموں کو تو ان کی محنتوں کے صلے کے طور پر کوئی تنخواہ کوئی انعام تو دُور رہا، جھڑکیاں اور مار پیٹ ہی ملتی تھی۔

آخر کار انھوں نے جنگل سے لکڑیاں اور گھاس پھونس لاکر مکانات تعمیر کیے اور ایک کالونی وہاں بن گئی ایلس، جیسی اور انکل البرٹ ایک مکان میں رہنے لگے۔ ان لوگوں نے اب کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی کھیت لگاتا، اس پہ کام کرتا، محنت کرتا، کوئی مزدوری کرتا اور کوئی دوسرے کام۔ اس طرح ان کی زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ جیسی کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگتا۔ اس نے تو ہمیشہ خود کو جبر و ستم کی چکّی میں پستا ہی پایا تھا۔ اب جو آزادی کی سانس لی تو زندگی بہت خوبصورت دکھائی دینے لگی مگر اکثر اپنے پاپا کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی۔ اور جب پاپا کی یاد آتی تو ہر چیز بے کیف معلوم ہوتی۔ کسی چیز میں اُس کا دل نہ لگتا۔ کچھ بھی اچھا نہ لگتا، ہر رنگ بے رنگ نظر آتا۔ اور وہ چپ چاپ ایک کونے میں جا کے بیٹھ جاتی۔

اس روز جیسی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل کر گھر واپس آئی تو ایک نئی صورت دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ ایک اونچا سا لمبا سا بینگرو، ایلس اور انکل البرٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ جیسی کو دیکھ کر وہ لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ سب بڑے پُر اسرار انداز میں مُسکرا رہے ہیں۔

"کیا بات ہے ماما؟" جیسی نے پوچھا۔

"پہچانو تو جیسی یہ کون ہیں؟" ایلس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ جیسی حیرت سے اس اجنبی کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اُسے اچانک اپنی دُعا یاد آ گئی جس میں اُس نے خدا سے آزادی اور پاپا مانگے تھے۔ غیر یقینی انداز میں اُس کے منہ سے نکلا "پاپا" اور پاپا نے بازو پھیلا دیے اور جیسی دوڑتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔ ہر طرف دھنک کے رنگ بکھر گئے تھے اور جیسی کو لگ رہا تھا جیسے یہ دنیا اور زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔ اتنی خوشی، اتنا سکون، اتنا سُکھ تو اُس نے کبھی پایا بھی نہ تھا۔

"ماما میں نے اس آزادی کے لیے ہی دُعا کی تھی۔ ماما اور پاپا کے ساتھ آزادی۔ مکمّل آزادی۔ انکل ابراہام زندہ باد" اُس نے اپنے پاپا اور ماما کے گلے میں ہاتھ ڈال کے کہا۔

---

ایک جیب کترا نئے فیشن کے کپڑے دیکھ رہا تھا۔ جیب کترے کے شاگرد نے کہا۔
"اُستاد کیا خریدنے کا ارادہ ہے؟"

جیب کترا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نئے فیشن کے کپڑوں میں جیب کہاں ہوتی ہے"

شیخ محمد سعید، کوٹ رادھاکشن

# نیا سفر

مصطفیٰ چاند

بندرگاہ اس وقت مکمل طور پر رونقوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ساحل سے لگا امریکی جہاز "ہیرالڈر" سانس لیتی ہوئی موجوں پر ہلکورے لے رہا تھا۔ جہاز سے لگی مضبوط سیڑھی انسانی قدموں سے دوہری ہوئی جارہی تھی ساحل پر لوگوں کے شور سے وقت کی تیزی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہر کوئی تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا سیڑھیاں پھلانگتا دکھائی دیتا۔

انکل وائٹو نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نگاہ دوڑائی اور گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ انہوں نے ایک نظر اپنے پیچھے بیٹھے ٹمی ۔ اور ٹیوجو کو گھورا، جو کھڑکیوں سے باہر امریکہ کی اونچی اونچی بلڈنگوں کا آخری نظارا کر رہے تھے اُن کے معصوم گالوں پر بے انتہا خوشی جھلک رہی تھی شاید آنے والے خوش کن لمحات نے اُن کو مسرور کر رکھا تھا اور گاڑی دھیرے دھیرے بندرگاہ سے قریب ہوتی جارہی تھی۔

چھ بجکر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ بندرگاہ پر لوگوں کا جم غفیر زرق برق لباس میں بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ اُسی لمحے مشرقی سمت لگی گھڑی چلاّنے لگی۔ ساحل کے قریب کرین میں بیٹھا شخص ایک دم حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے جہاز سے لگی سیڑھی کرین کے فولادی پنجوں میں قید ہو کر دوسری جانب زمین پر ڈھے گئی۔ مسافروں کا ساحل پر اُترنے کا نظام منقطع کردیا گیا تھا۔ سیڑھی کو ہٹتے دیکھ کر عرشے پر کھڑے ننھے ننھے بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب اُن کو کوئی نہیں اتارے گا۔

پانچ بجے پھر گھنٹی کی آواز گونجی اور جہاز کا پورا عملہ حرکت میں آگیا۔ اینکر میں پھنسے رسّے نکال کر گرادیے گئے۔ تب جہاز کا انجن اسٹارٹ ہو کر چمنی سے سیاہ دُھواں اُگلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز کا رُخ پھر چکا تھا۔ اُسی وقت ساحل پر لگے اسپیکروں سے جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔

"ہیرالڈر" کچھ دیر تک وہیں کھڑے ہچکولے کھاتا رہا اور بلآخر کیپٹن کی ہدایات ملنے پر "بھوں... بھوں..." کی طویل سیٹی بجاتا ہوا سمندر کا سینہ چیرنے لگا۔

جہاز کی چلنے کی رمق دیکھ کر لوگوں کے جوش و خروش میں تیزی آگئی تھی وہ سب دیوانہ وار چلاّنے لگے۔ جہاز ہر فعل سے بے نیاز خراماں خراماں موجوں سے ٹکراتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بندرگاہ پر کھڑے لوگ جہاز کے اُوجھل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ تقریباً گیارہ منٹ کے بعد ہی پانچ سو آدمیوں پر مشتمل بڑا سا جہاز مکھی کی طرح اُن کی نگاہوں میں پھڑپھڑانے لگا اور بلآخر ایک دم نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔

بندرگاہ پر کھڑے لوگ بوجھل بوجھل قدموں سے ایک دوسرے کے پیچھے بندرگاہ سے باہر نکلنے لگے۔

امریکی مسافر بردار جہاز ہیرالڈر مچلتی موجوں کو چیرتا ہوا اپنی منزل سے قریب ہوتا جارہا تھا۔ جہازی عملے کے چالیس افراد سمیت پانچ سو آدمیوں پر مشتمل یہ قافلہ لندن کی جانب محوِ سفر تھا۔ جہاز میں ہر ملک کی نمائندگی ہو رہی تھی، افریقی، ایرانی، جاپانی، انڈین، پاکستانی، فرانسیسی، اطالوی، غرض ہر ملک سے تعلق رکھنے والے افراد کہیں نہ کہیں ضرور بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ مختلف سوچوں اور متضاد نظریات کے حامل افراد اس وقت اپنے نظریات سے بالاتر ہو کر محوِ گفتگو تھے ایک طرف ایرانی اور عراقی بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ تو دوسری طرف پاکستانی اور انڈین خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عرشے پر عربی اور افریقی گلے میں بانہیں ڈالے سمندر پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

جہاز لمحہ بہ لمحہ اپنی رفتار بڑھاتا، موجوں کو پیچھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔
پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز کھلے اور گہرے سمندر میں آچکا تھا رات کی وجہ سے پانی بھی سیاہ آسمان کا حصہ لگ رہا تھا۔ البتہ میں لگی تمام بتیاں روشن کر دی گئی تھیں۔

ڈیوڈ اور جمی کچھ دیر تک اپنے کمروں میں رہے اور بالآخر اُکتا کر باہر عرشے پر آکھڑے ہوئے۔ دونوں کی عمروں میں دو سال کا فرق تھا۔ ڈیوڈ صاف رنگ کا تھا جس کی عمر گیارہ سال تھی جبکہ جمی ڈیوڈ کی نسبت قدرے سانولی رنگت کا حامل تھا۔ اور اس جون کے اختتام پر وہ تیرہ سال مکمل کر رہا تھا۔ دونوں کی منزل لندن تھی، جہاں اُن کی آنٹی جولین نے انہیں اسکول کی چھٹیوں پر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ سیر و تفریح کے رسیا جمی اور ڈیوڈ اس طرح کے کسی بھی موقع کو ضائع کرنا بے وقوفی سمجھتے تھے اُن کے نزدیک تو یہ بات اہم تھی کہ سفر ہو چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو....!
یہ سفر بھی وہ تنہا ہی کر رہے تھے۔ انکل وائٹو نے بہت اصرار کیا کہ وہ اُن کو لندن تک چھوڑ آئے مگر دونوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور مجبوراً انکل وائٹو کو جمی اور ڈیوڈ کے ممی، ڈیڈی کو لے کر واپس گھر جانا پڑا اور پھر یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ایسے تنہا سفر کر چکے تھے۔ اس لئے کسی بھی قسم کا خوف یا پریشانی اُن کے لئے مسئلہ نہیں بنی ہوئی تھی۔
اس وقت وہ میس میں کھانا کھا کر رات کے مناظر کو دیکھنے عرشے پر آگئے تھے جمی کے گلے میں دوربین لٹک رہی تھی جسے وہ بار بار اپنی آنکھوں سے لگا کر دیکھتا اور پھر چھوڑ دیتا۔

" جمی ... دیکھو وہ جہاز کتنا خوبصورت لگ رہا ہے ... " ڈیوڈ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔
" ہاں .... لائٹوں کے جلنے سے اور زیادہ اچھا لگ رہا ہے غالباً یہ بحری فوج کا جہاز ہے دیکھو اس کے پیچھے بڑی بڑی توپیں بھی لگی ہوئی ہیں ... "
" ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے .... " دونوں نے ایک دوسرے کی تائید کی۔ وہ بہت دیر تک عرشے پر کھڑے مختلف چیزوں پر اپنی اپنی رائے دیتے رہے۔ جمی کو بحث سے دلچسپی تھی وہ ہر بات میں سے کئی نقطے نکالنے کا عادی تھا جبکہ ڈیوڈ بات سنتا اور اس کی ہاں یا نہیں میں حمایت یا مخالفت کر دیتا۔ وہ کچھ دیر مزید وہیں رہے اور واپس اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔

---

آج سفر کو تیسرا دن مکمل ہو رہا تھا لیکن ڈیوڈ اور جمی اپنے کسی ہمسفر سے دوستی نہیں کر سکے تھے۔ درحقیقت مسافروں میں ان کی عمروں کا کوئی لڑکا نہ تھا ہی نہیں اور اگر کوئی تھا بھی تو اُس سے ابھی تعارف نہ ہوا تھا۔ البتہ ان کے اطراف بیٹھے بوڑھے نابینا جیمل کنگ اور جاسوسی کہانیاں لکھنے والے راڈلائٹ سے رسماً سلام دُعا ہو چکی تھی۔ جیمل کنگ اپنے زمانے کے معروف باکسر تھے اور کئی انٹرنیشنل مقابلوں میں ہزاروں ڈالرز کے انعامات و تحائف حاصل کئے تھے مگر ایک حادثے میں اُن کی دونوں آنکھوں کی روشنی ضائع ہو گئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ایسا ہی کوئی دوسرا حادثہ ان کی روشنی واپس

لاسکتا ہے۔ جبکہ راڈ لائٹ امریکی رسالوں میں اپنے اس قلمی نام سے جاسوسی کہانیاں لکھتے تھے اصل نام جیفرٹ تھا۔ اس کے علاوہ سامنے بیٹھی امریکی خاتون اپنی بیٹی ایملی سے ملنے اس کے پاس جارہی تھی اُن سے آگے بھی لوگ بیٹھے تھے جن سے اُن کا تعارف نہ ہوسکا تھا۔

ڈیوڈ کچھ دیر انگریزی میگزین "نیو ایج" کا مطالعہ کرتا رہا گویہ اُس کے مزاج کا نہ تھا مگر پھر بھی بوریت ختم کرنے کا کوئی تو ذریعہ چاہیے تھا لیکن وہ جلد ہی اس سے اُکتا گیا اور رسالہ ایک طرف پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔

"کہاں جارہے ہو ....؟" جمی نے اُس کو اٹھتے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

"باہر ...." اُس نے ایک لفظ میں جواب دیا اور یہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں ....،" جمی لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا اُس کے پیچھے چل دیا، جس وقت وہ عرشے پر پہنچے وہاں پہلے ہی سے اُن کی عمر کا ایک لڑکا کھڑا تھا اُس کی پیٹھ ڈیوڈ کی طرف تھی اور چہرہ جہاز کے اگلے رُخ پر ....!

ڈیوڈ نے ایک نظر جمی کی طرف دیکھا اور اُس لڑکے کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا آپ امریکن ہیں ....؟"

"جی نہیں...." لڑکے کے جواب پر وہ ٹھٹکا گیا۔ پہلی مرتبہ اُس کا اندازہ غلط ہوا تھا اور یوں بھی رنگت اور جسامت کے اعتبار سے وہ امریکن بچہ ہی لگتا تھا۔

"پھر آپ ....؟" جمی نے اب اپنی ذہانت کا امتحان لینا چاہا کر وہ لڑکا پہلے ہی بول پڑا۔

"میرا نام محمد علی ہے اور میں پاکستانی ہوں"۔ دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے اُس پاکستانی بچے نے بھی دونوں کی حیرانگی کو محسوس کرلیا تھا۔

"مجھے امریکہ میں رہتے ہوئے نو سال ہوچکے ہیں میں جب دو سال کا تھا اُس وقت مجھے میرے انکل یعقوب یہاں لائے تھے اور اب یعقوب انکل کے پاس میں لندن جارہا ہوں"۔ محمد علی نے جلدی سے اپنی کہانی بیان کردی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ بولتے محمد علی دونوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"آپ کے نام کیا ہیں ....؟"

"میں ڈیوڈ ہوں اور یہ میرا بھائی جمی .... ہم بھی لندن جارہے ہیں .." ڈیوڈ کی حیرت جب کم ہوئی تو اُس نے اپنا اور بھائی کا تعارف کرایا۔

"بہت خوب .... ہم تینوں کی منزل گویا ایک ہی ہے ...." محمد علی نے اُن سے گرمجوشی کے ساتھ دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ... لیکن صرف سفر کی منزل ..." جمی نے اپنی جرح کی عادت کا استعمال کیا۔

"جی ... ہاں.. جی... ہاں" تینوں نے مل کر ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہیں کھڑے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے "ڈبوئے" اور جمی کو محمد علی کی باتوں سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے اور ہر موضوع پر اچھا خاصا مطالعہ رکھتا ہے۔ کئی مسئلوں پر سیر حاصل گفتگو کے بعد وہ اب واپس اپنے اپنے کمروں کی طرف جا رہے تھے...

———•———

جمی چلتے چلتے رک گیا۔ آواز میں بڑی شیرینی تھی وہ وہیں رُک کر آنے والی آواز کو سننے لگا۔ محمد علی اپنے کمرے میں قرآن کھولے سورۃ فاتحہ کی ابتدائی آیات اور ترجمہ پڑھ رہا تھا۔

"ہر قسم کی تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور مالک ہے روزِ خدا کا۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ ایسے لوگوں کو راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا ہے نہ ان کے راستے پر جن پر تیرا غصہ ہوا۔ اور نہ گمراہوں کے راستے پر چلا۔"

جمی کے کچھ سمجھ میں نہ آسکا مگر وہ آواز کی لطافت سے متاثر ضرور ہو گیا تھا۔ دروازہ کھول کے وہ اندر داخل ہوا۔ محمد علی جائے نماز پر ایک طرف قرآن رکھے سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر جمی نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا۔ اور میز کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی تھوڑی ہی دیر بعد فارغ ہو کر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے تھے....؟" جمی نے اُسے دیکھتے ہی کہا اور پھر خود ہی دوبارہ بولا

"شاید عبادت کر رہے تھے۔"

"ہاں..." محمد علی نے چھوٹا سا جواب دیا اور چائے بنانے لگا۔

"محمد علی، نہ تمہارا خدا تم نے دیکھا نہ ہم نے دیکھا پھر تم نے سجدہ کس کو کیا...؟" جمی بحث کے موڈ میں تھا۔ محمد علی نے ایک نظر جمی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"تمہارا خدا ہر وقت ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہمارے دل کے عبادت خانے میں ہمہ وقت موجود رہتا ہے اگر دل چیر کر دیکھنے کی قوت تم میں ہے تو دیکھ سکتے ہو...." محمد علی کے جواب پر وہ پٹپٹا کر رہ گیا۔

"خدا تو وہ ہوتے ہی جو نگاہوں کے سامنے رہیں..." جمی کے جواب پر محمد علی زور سے ہنسا اور کھلکھلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ خدا ہی کیا جسے تم جیبوں میں ڈال کر پھرو۔ اُس کی حفاظت کرو خدا تو وہ ہوتا ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت کرے۔"

جواب اَب بھی بڑا بھرپور تھا۔ جمی پھر کھسیانا سا ہو کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ بہت دیر تک وہ کسی ٹھوس ثبوت کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن ہر جگہ سے ناکام ہو کر اُس کا ذہن واپس آ گیا۔

"کیا یہ تمہاری مقدّس کتاب ہے ....؟" جمی نے قرآن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں یہ قرآن ہے..." محمد علی نے احترام کے ساتھ قرآن کو گود میں رکھ لیا۔

"مجھے سناؤ..." اُس نے جلدی سے کہا اور محمد علی جگہ جگہ سے اُسے قرآن کے نوری حصّے سنانے لگا۔

"اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے اور ہم نے تم کو کائنات دی تسخیر کرنے کے لئے... اور گھومو زمین کے اندر اور تلاش کرو جو اس میں چھپا ہوا ہے اور دیکھو چاند اور سورج کو۔ اور نیکو کاروں کے لئے جنّت کی نہریں ہوں گی اور بدکاروں کے لئے جہنم کی آگ اور داروغہ اُن کے جسموں کو تپتی ہوئی سلاخوں سے جلایا کریں گے۔ بے شک وہی لوگ کامیاب ہوئے جنہوں نے نیک اعمال کئے..."

محمد علی قرآن کی مختلف سورتیں اُس کے سامنے ترجمے کے ساتھ پڑھتا رہا۔ جمی کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور بالآخر خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ محمد علی بھی اپنے بیگ سے کپڑے نکال کر دوسرے کمرے میں بدلنے چلا گیا۔

صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی جہاز اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دُور دُور تک نیلا آسمان پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف بہت ساری کونجیں روئی کے ٹکڑوں پر پھڑپھڑاتے ہوئے اپنی چونچیں مار رہی تھیں اور دوسری طرف مرغابیوں کی ایک قطار مغربی سمت سے اُڑتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

"ڈیڈ کیا ہمارا خدا بہت طاقت ور ہے ....؟" جمی نے تھکے تھکے لہجے میں عرشے پر کھڑے ہو کر پوچھا

"ہاں اور کیا.. کیا تمہیں پتہ نہیں ...؟" اُلٹا ڈیوڈ نے اُس سے سوال کر ڈالا۔

مگر محمد علی کا خدا تو اُس کے دل میں رہتا ہے ... کس طرح رہتا ہوگا دل میں ... گرمی نہیں لگتی ہوگی خدا کو..."

جمی نے بالکل ہی بچکانہ سے انداز میں کہا آج واقعی وہ بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے پتہ نہیں ..." ڈیوڈ پھر سے سمندر میں اُٹھنے والی لہروں کو گھورنے لگا۔

اُسی وقت جہاز میں ہلکا سا دھماکہ ہوا اور میس میں سے دُھواں نکلنے لگا۔ جمی نے چونک کر دیکھا جہاز میں سے آگ کے شعلے اُمڈ رہے تھے۔

ڈیوڈ آگ ..." وہ ایک دم چلاّیا ڈیوڈ بھی گھبرا کر سُرخ شعلوں کو اُبلتا ہوا دیکھنے لگا آگ کے لمبے لمبے شعلے جلدی جلدی جہاز پر پھیلتے جا رہے تھے ڈیوڈ کو آگ کے شعلے دیکھ کر اژدھے کی وہ کہانی یاد آ گئی جس میں مُنہ سے آگ برساتا اژدھا ہر ایک کو جلا دیا کرتا تھا ڈیوڈ کو ایسا لگا تھا وہی اژدھا اِس جہاز پر چڑھ گیا ہو ....!

"ڈیوڈ، محمد علی کہاں ہے ...؟ اچانک جمی کو محمد علی کی یاد آئی۔

"وہ تو اپنے کمرے میں ہے ..." ڈیوڈ نے گھبرا کر کہا تو جمی کچھ سنے بغیر اندر کی طرف بھاگا۔ سیاہ گاڑھا دُھواں عرشے کو ہڑپ کرتا جارہا تھا خطرے کا سائرن بج رہا تھا لوگوں کی چیخ و پکار بڑھتی چلی جارہی تھی دُور دُور تک کوئی جہاز نظر نہ آتا تھا۔

" لائف بوٹ سمندر میں اتاری گئی تھیں اور مسافروں کو جلدی جلدی اُس میں بٹھا کر کسی محفوظ علاقے تک پہنچایا جارہا تھا۔ جہاز جل جل کر بکھرتا جارہا تھا۔

جمی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہوچکی تھی۔ لیکن وہ اب تک باہر نہیں آیا تھا ڈیوڈ کو بے چینی سی ہونے لگی تھی آگ کے گرم شعلوں کی تپش سے اُس کی کھال جھلنے لگی تھی۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا، اُسی وقت دُور سے محمد علی چلاتا ہوا ڈیوڈ کی طرف آنے لگا۔

"ڈیوڈ! جمی کہاں ہے ..؟" وہ دُور ہی سے چلایا۔

" میں نہیں جانتا ... ؟ وہ تمہیں تلاش کرنے گیا تھا..." ڈیوڈ نے پوری قوت سے چیخ کر کہا اور محمد علی اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔

جہاز لمحہ بہ لمحہ خالی ہوتا جارہا تھا۔ اُس وقت تک چار لائف بوٹ، سمندر میں اُتاری جاچکی تھیں۔ کچھ لوگ جہاز کے بڑے بڑے تختوں کے سہارے سمندر میں ہچکولے کھا رہے تھے۔ اور دُور سے ایک جہاز تیزی سے اسی طرف آرہا تھا... !

محمد علی آگ کے شعلوں سے کودتا ہوا کمروں میں گریگ کو پکار رہا تھا...

" جمی ... جمی ... " لیکن ہر طرف آگ سے لکڑیوں کے تڑخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دُھوئیں میں وہ واپسی کا راستہ بھی بھول چکا تھا۔ اچانک اُس کے ہاتھ میں کسی کی قمیض آگئی وہ تیزی سے اُسی قمیض والے کو پکڑ کر راستہ تلاش کرتا ہوا اُوپر چڑھنے لگا۔ آگ اُس کے کپڑوں کو بھی چاٹنے لگی تھی۔

وہ جلتا ہوا اُوپر آگیا ڈیوڈ اب بالکل جہاز کے آخری کونے پر کھڑا تھا اُس نے دیکھا وہ جمی ہی تھا اُس کے سینے کے ساتھ ایک ننھا سا بچہ چمٹا ہوا تھا اور جمی کے دونوں ہاتھ اُس کو بھینچے ہوئے تھے۔

"ڈیوڈ سمندر میں کُود جاؤ ..." اچانک محمد علی چلایا اور تینوں ایک ساتھ سمندر میں کُود گئے۔ ایک چھپا کا سا ہوا اور وہ پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہوجاتی تو جلتا ہوا بڑا سا شہتیر اُن کو موت سے قریب کردیتا۔

امدادی جہاز قریب آچکا تھا غوطہ خوروں نے پانی میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے لوگوں کو نکال کر جہاز میں بٹھانا شروع کردیا۔

آدھ گھنٹے بعد ڈیوڈ اور محمد علی ہوش میں آچکے تھے۔ انہوں نے دیکھا زخمیوں کی باری باری طبی امداد پہنچائی جارہی تھی۔ وہ سب سے آخر میں تھے۔

محمد علی نے جمی کے ہاتھوں سے جکڑے بچے کو نکالا اچانک وہ بری طرح چونکا جمی کے سینے کے ساتھ اُس کا مقدس قرآن چمٹا ہوا تھا... اُسی وقت جمی ادھ کھلی آنکھوں سے محمد علی سے کہنے لگا۔

"محمد علی میں نے تمہارے خدا کی کتاب کی حفاظت کی ہے نا... اب تم اپنے خدا سے کہو وہ میرے بھی دل میں آجائے جس طرح تمہارے دل میں سارا وقت رہتا ہے...."

محمد علی نے فرطِ مسرت سے اُس کے ماتھے کو چوم لیا۔

"دیکھا... جمی میرا خدا کتنا طاقتور ہے اُس نے تم کو موت کے کانٹے دار پروں سے بچا لیا۔ میرا خدا تمہارے دل میں ضرور آئے گا... ضرور آئے گا۔ میرے ساتھ پڑھو... لاالہ اللہ محمد رسول اللہ "کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔" محمد علی جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔

جمی پڑھنے لگا۔

"لاالہ اللہ محمد رسول اللہ..."

"اب تم جمی نہیں جاوید ہو... جاوید جو کبھی نہیں مٹتا... تم آنکھیں بند کر لو میں تمہیں مقدس قرآن کی آیات سناتا ہوں پھر خدا آہستہ آہستہ تمہارے دل میں اُتر جائے گا..."

محمد علی دوبارہ قرآن کی مختلف آیات اپنی شیریں آواز میں سنانے لگا اور جاوید آنکھیں بند کیے سنتا رہا پھر رفتہ رفتہ جاوید کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے دل کا دروازہ کھل رہا ہو اور مقدس خدا اندر داخل ہو گیا ہو۔ وہ خوشی سے چلانے لگا۔

"محمد علی... محمد علی... میرے دل میں کوئی آگیا... شاید خدا آگیا محمد علی..."

"مبارک ہو... جاوید تمہیں ایک نیا سفر مبارک ہو... تم نے منزل کے آنے سے پہلے منزل پالی..." وہ دور آسمان کے پردوں میں چھپے خدا کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

اور جہاز لہروں سے ٹکراتا ہوا دوبارہ لندن کے ساحل "ساؤتھ پول" کی طرف بڑھنے لگا...!!


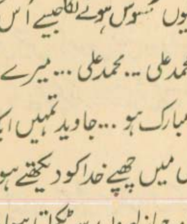

راہنما
۱۰۴ صفحات پر مشتمل
بچوں قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ
قرآن کی یہ سچی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں
اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

# سائنس اِنکوائری

سائنسی موضوعات پر آپ کے

ایاز محمود

● دن کے وقت سورج کی روشنی سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ لیکن سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت ہمیں دوسرے رنگ مثلاً سُرخ نارنجی، وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

سعدیہ جمیل نارتھ کراچی۔ کراچی

سب سے پہلے تو اس بات کی مبارک باد قبول کیجیے کہ آپ کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے نتیجے میں آپ کے ذہن میں سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں جو ایک نہایت اچھا رجحان ہے۔ یاد رکھیے کہ سائنس کی بنیاد ہی کب؟ کیوں؟ کیا؟ اور کیسے؟ پر مبنی سوالات اور اُن کے جوابات کی تلاش کی کوشش میں ہے۔

اب آئیے اپنے سوال کی طرف۔ سائنس کے طالبِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ سفید نظر آنے والی سورج کی روشنی دراصل سات رنگوں یعنی سُرخ، نارنجی، زرد، سبز، نیلے اور بنفشی رنگ کی روشنیوں سے مِل کر بنی ہے۔ یہ روشنیاں جن کا طُولِ موج مختلف ہوتا ہے فضا میں موجود سالموں، آبی بخارات، گرد اور آلودگی کے ذرّات کے ساتھ ٹکرا کر فضا میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ دن کے وقت چونکہ فضا نسبتاً زیادہ صاف ہوتی ہے۔ روشنی کی موجیں بکھرتی نہیں ہیں۔ اور ہمیں ان سب کا مجموعہ یعنی سفید روشنی نظر آتی ہے۔ طلوع اور غروبِ آفتاب کے وقت چھوٹے طُولِ موج کی روشنیاں بکھر جاتی ہیں اور ہم تک صرف لمبے طُولِ موج کی روشنیاں یعنی سُرخ، نارنجی، زرد وغیرہ ہی پہنچتی ہیں۔

● دنیا کا سب سے پہلا سائنس دان کون تھا؟ ثانیہ ممتاز طور۔ پنڈ داد نخان

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ نسلِ انسانی کی ابتدا اور تاریخ نویسی کے درمیان بڑا زمانہ حائل ہے لہٰذا ان سب افراد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا نہایت مشکل کام ہے جو تاریخ نویسی کے دور سے پہلے اس دنیا کے باشندے تھے۔

تاریخ کے صفحات میں اوّلین سائنس دانوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام "ثالوث" کا ہے۔

ثالوث کی زندگی کا بیشتر حصّہ یونان میں بسر ہُوا وہ لگ بھگ ٦٥٠ ق م میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے

تجربے اور مشاہدے سے اجرامِ فلکی (چاند، سورج ستارے، سیارے وغیرہ) کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں انھیں صدیوں بعد ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ثالوث نے چاند گرہن اور سورج گرہن کی وجوہات بیان کیں اور اُنھیں دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ کسی قسم کے آلات کے بغیر اہرامِ مصر کی درست پیمائش اس کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ اس نے جیومیٹری کے چند اصول بھی وضع کیے جو آج بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

● پلاسٹک سرجری سے کیا مُراد ہے۔۔؟
مفصل جواب دیجیے - علی عبدالقیوم مغل، کنزی

جسم کی کسی ظاہری بدنمائی کو خاص قسم کے آپریشن کے ذریعے دُور کرنے کو پلاسٹک سرجری کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی حادثہ میں جُھلس جانے والے یا زخموں سے مسخ ہوجانے والے چہرے کو دوبارہ پہلے جیسی حالت میں لے آنا پلاسٹک سرجری کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ بعض دولت مند خواتین اپنے چہرے کی جُھرّیوں اور بڑھاپے کے دیگر اثرات کو مٹانے کے لیے بھی پلاسٹک سرجری کا سہارا لیتی ہیں اس قسم کی پلاسٹک سرجری کو کاسمیٹک سرجری بھی کہا جاتا ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ کام یا کھیل کُود کے دوران اکثر چوٹیں لگتی رہتی ہیں۔ یا کبھی لاپرواہی سے ہاتھ یا جسم کا کوئی اور حصّہ معمولی سا جل جاتا ہے۔ زخم تو بھر جاتا ہے مگر اپنی یادگار کے طور پر ایک مدھم سا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد یہ نشانات بھی معدوم ہوجاتے ہیں۔ لیکن زیادہ گہرے زخموں کے نشانات وقت کے ساتھ مُندمل نہیں ہوتے۔

دوسرے الفاظ میں زخم کھال کو اس بُری طرح مجروح کردیتے ہیں کہ کھال اپنی اصلی حالت میں واپس آنے کی صلاحیت کھودیتی ہے۔

ایسی صورت میں جسم کے غیر مجروح شُدہ حصوں مثلاً بازوؤں یا رانوں سے نہایت مہارت کے ساتھ کھال اُتار کر زخم والی جگہ پر پیوند کاری کی جاتی ہے۔

یہ ایک نہایت پیچیدہ اور صبر آزما کام ہے۔ تسلّی بخش نتائج کے لیے بعض اوقات پیوند کاری کے متعدد آپریشن بھی کرنے پڑتے ہیں۔

ان خاتون کی لمبی ناک پلاسٹک سرجری کے بعد ستواں ہوگئی

● گذشتہ ماہ آنکھ مچولی میں خوفناک اژدھے کی تصویر دیکھی تو ایک سوال ذہن میں اُبھرا۔ ھم نے اکثر ایسے اژدھوں کی تصاویر دیکھی ھیں۔ جن کے منہ سے آگ نکل رھی ھوتی ھے۔ کیا واقعی ایسے اژدھے ھوتے ھیں؟ براہِ کرم اژدھوں کے متعلق کچھ بتائیں ۔۔۔؟

حسن اعجاز۔ صادق آباد۔

بڑی جسامت کے سانپ کو عُرفِ عام میں اژدہا کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں اور عموماً ان کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۱۵ فٹ ہوتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ لمبائی والے اژدہے بھی دیکھے گئے ہیں۔

اژدہے زہریلے نہیں ہوتے۔ یہ اپنے شکار کو سالم ہی نگل لیتے ہیں اور پھر اُسے ہضم کرنے کے لیے کافی دیر تک بے سُدھ پڑے رہتے ہیں۔ چوہے، خرگوش اور پرندے وغیرہ عام طور پر اُن کی خوراک بنتے ہیں مگر یہ بڑے جانوروں مثلاً ہرن وغیرہ کو بھی نہیں چھوڑتے اور موقع ملے تو انھیں بھی چٹ کر جاتے ہیں۔

اژدہے یوں تو دنیا کے تقریباً تمام خطوں میں پائے جاتے ہیں مگر سب سے لمبا اژدھا جنوبی امریکہ میں ملتا ہے جسے "اناکونڈا" کہتے ہیں۔ اناکونڈا ایک نہایت طویل القامت اژدہا ہے۔ جس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۳۵ سے ۳۷ فٹ کے درمیان تصوّر کی جاتی ہے۔ ان کا وزن ایک ہزار پونڈ تک ہوتا ہے۔

آپ نے آگ اُگلنے والے اژدہوں کے بارے میں پوچھا ہے، تو بھائی ان کا تذکرہ قدیم قصّے کہانیوں میں تو ملتا ہے مگر اسے یہیں تک محدود سمجھنا چاہیے۔ اس بات کی کوئی سائنسی حقیقت نہیں۔ چین اور مشرقِ بعید کے بعض ملکوں میں بُدھ مت کے ماننے والوں کے عقیدے کے مطابق ایسے اژدہے ہوتے ہیں، اسی لیے اُن کے کلچر اور آرٹ میں جا بجا شعلہ فشاں اژدہے کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ ایسے اژدہوں کو Dragon کہتے ہیں۔ ان کا تصور بعض یورپی ممالک اور امریکہ میں بھی ہے مگر تصور ہی تصور ہے حقیقت نہیں ہے۔


سفر مبارک

معلومات بھی ــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

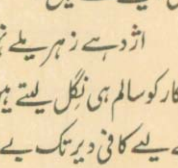

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرکے حاصل کرسکتے ہیں

# حرفوں کا گورکھ دھندا

تخلیق و ترتیب      عظیمہ مُغل

ذہانت کے روایتی مقابلوں سے ہٹ کر اور معموں کی گھسی پٹی روش کو چھوڑ کر ہم آپ کے لئے ایک بالکل نئے ڈھنگ کا مقابلہ لے کر آئے ہیں۔ ۳۲ خانوں پر مشتمل ایک خاکہ آپ کے سامنے ہے ابتدائی دو خانوں میں ایسے حروف لکھیں کہ وہ مل کر ایک لفظ بن جائے پھر تین خانوں میں ایسے حروف لکھیں کہ وہ بھی ایک سہ حرفی لفظ بن جائے اسی طرح چار، پانچ پھر چار تین اور دو خانوں میں حروف بھرتے چلے جائیں اور الفاظ بناتے رہیں، یہاں تک کہ آپ سات ایسے الفاظ بنانے میں کامیاب ہوجائیں کہ وہ الفاظ مل کر ایک مکمل اور بامعنی جُملہ بن جائے۔ اگر کوئی ساتھی ایسا جُملہ بنانے میں کامیاب ہوجائے جو کوئی علمی بات، کوئی دانائی کا نکتہ یا کوئی خوبصورت قول ہو تو انعام اُسی کا ہُوا۔ سب سے خوبصورت جُملہ بنائیے۔۔ بہترین انعام پائیے۔ آپ کی ذہانت کو ہمارا کھُلا چیلنج ہے ہم نے آپ کی آسانی کے لیے اور آپ کو سمجھانے کی خاطر ایک خاکہ بھر کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے ... جواب ماہِ رواں کی آخری تاریخ تک مل جائیں۔ کوپن اور خاکہ ایک ساتھ آنا شرط ہے۔

(ادارہ)

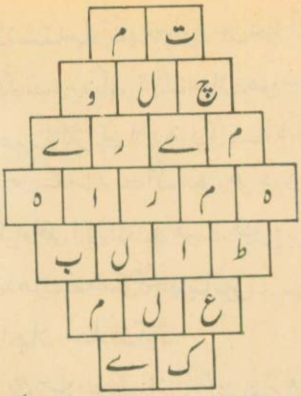


تم چلو میرے ہمراہ طالب علم کے

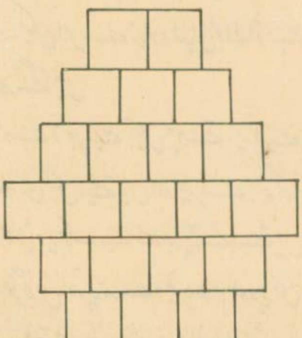

یہ خاکہ پُر کر کے ماہنامہ آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کیجیے

نام طالب علم ___________ کلاس ______

تعلیمی ادارہ ______________

______________

پتا ______________

______________

عقیل عباس جعفری

# گنی چنی معلومات

اعداد ہماری زندگی کا جُزوِلازم ہیں۔۔۔ظاہری واقعات ہوں یا باطنی معاملات، یہ سب کسی نہ کسی طرح اعداد اور ہندسوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اعداد سے ہماری زندگی کے اس گہرے تعلّق کی اہمیّت کے پیشِ نظر ہمارے محقق ساتھی عقیل عباس جعفری نے بڑی محنت اور جانفشانی سے معلومات کا یہ انوکھا سِلسلہ شروع کیا ہے جو اعداد کے گِرد گھومتا ہے۔صفر سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ دیکھیں کہاں جاکر ختم ہوتا ہے۔۔۔اس مفید سلسلے کو پڑھیے اور اعداد کے حوالے سے اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے (ادارہ)

(۷۰)

- ۹ھ کو عام الوفود (وفود کا سال) کہا جاتا ہے۔اس سال عرب کے گوشے گوشے سے ۷۰ وفود حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔
- رچرڈ ہیڈلی اور آئن بوتھم دونوں نے اپنی ۳۵۵ ویں ٹیسٹ وکٹ اپنے ۷۰ ویں ٹیسٹ میں حاصل کی تھی۔
- انسانی جسم کا سرد ترین مقام ناک کی نوک ہے۔جس کا درجہ حرارت ۷۰ درجے فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔
- ماجد خان نے ٹیسٹ کرکٹ میں ۷۰ کیچ پکڑے تھے۔
- ابُو نصر فارابی ۷۰ زبانیں جانتا تھا۔
- کولمبس نے جس سفر میں امریکہ دریافت کیا تھا۔اس میں اس نے بحرِاوقیانوس کا سفر (۳ اگست ۱۴۹۲ء تا ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء) ۷۰ دنوں میں طے کیا تھا۔
- آئن چیپل نے ۷۰ ٹیسٹ میچوں میں کیچ پکڑنے کی سنچری مکمل کی تھی۔
- سکندرِ اعظم نے ۷۰ شہر اور قصبے بسائے تھے۔
- بیڈمنٹن کی چڑیا (شٹل کاک) کے پر ۷۰ ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔
- دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ہمنگ برڈ اپنے پروں کو ایک منٹ میں ۷۰ مرتبہ حرکت دے سکتا ہے۔

● ۲۱-۱۹۲۰ء میں آسٹریلیا کے جیک گریگوری نے جنوبی افریقہ کے خلاف صرف ۷۰ منٹ میں ٹیسٹ سینچری بناکر کم سے کم وقت میں سینچری بنانے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

(۷۱)

● پاکستان نے اپنا سوواں ٹیسٹ میچ ۱۰ تا ۱۵ مارچ ۱۹۷۹ء آسٹریلیا کے خلاف کھیلا تھا۔ یہ میچ پاکستان نے ۷۱ رنز سے جیتا تھا۔

● ۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب قائدِاعظم کا انتقال ہُوا تو ان کی عمر ۷۱ سال ۸ ماہ ۲۷ دن تھی۔

● سطحِ زمین کا ۷۱ فیصد حصّہ پانی پر مشتمل ہے۔

● مائیکل ایچ ہارٹ کی مشہور کتاب "تاریخِ انسانی کے سو سب سے زیادہ بااثر افراد" میں یورپی شخصیات کی تعداد ۷۱ رہی ہے۔

● مشہور باکسر جو لوئیس نے اپنے کیریئر میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۹ء تک عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ کے ۷۱ مقابلوں میں حصّہ لیا تھا۔ جن میں سے اُس نے صرف تین مقابلوں میں شکست کھائی تھی۔

● ۳۹۹ ق م میں جب سقراط نے زہر کا پیالہ پیا تو اس کی عمر ۷۱ برس تھی۔

● قبرص میں صرف ایک ریلوے لائن ہے جو ۷۱ میل طویل ہے یہ ریلوے لائن شمالی بندرگاہ فاماگستا کو دارالحکومت نکوسیا سے ملاتی ہے۔

● برطانیہ کا سب سے بڑا ایئرپورٹ ہیتھرو ایئرپورٹ ہے۔ جہاں ۶۲ ممالک کی ۷۱ فضائی کمپنیوں کے جہاز آتے جاتے ہیں۔

● ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اردو کے عظیم شاعر غالب کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۱ برس تھی۔

● سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، اسرائیل اور ہالینڈ میں مردوں کی اور کویت، فجی، کیوبا اور ارجنٹائن میں عورتوں کی اوسط عمر ۷۱ برس ہے۔

(۷۲)

● شہدائے کربلا کی تعداد ۷۲ تھی۔

● قائدِاعظم کے مزار کے گنبد کا قطر ۷۲ فٹ ہے۔

● لوڈو کی بساط پر ۷۲ خانے ہوتے ہیں۔

- انسانی نبض ۷۲ دھڑکن فی منٹ کی رفتار سے دھڑکتی ہے۔
- کمبوڈیا کی زبان روتوکاس میں ۷۲ حروفِ تہجی ہیں۔
- برطانیہ میں ۷۲ کاؤنٹیاں ہیں۔
- کنفیوشس کا انتقال ۴۷۹ ق م میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۲ برس تھی۔
- ماؤنٹ ایورسٹ پر پانی ۷۲ درجے سینٹی گریڈ پر اُبل جاتا ہے۔
- امریکہ نے ریاست الاسکا، روس سے ۷۲ لاکھ ڈالر میں خریدی تھی۔

(۷۳)

- ابنِ بطوطہ کا انتقال ۱۳۷۷ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۷۳ سال تھی۔
- ۲۸ جنوری ۱۹۸۶ء کو خلائی شٹل چیلنجر خلا میں بھیجے جانے کے صرف ۷۳ سیکنڈ پر تباہ ہوگئی تھی۔ اس حادثے میں سات خلاباز ہلاک ہوئے تھے۔
- کیتھرائن ہیپرن، چار آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والی دنیا کی واحد اداکارہ ہے۔ اس نے اپنا چوتھا آسکر ایوارڈ ۱۹۸۱ء میں حاصل کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۳ برس تھی۔
- امریکہ میں عورتوں اور مردوں، دونوں کی مجموعی اوسط عمر ۷۳ ۶۶ سال ہے۔ (مرد ۶۸ ۶۹ سال، عورتیں ۷۶٫۵ سال)
- عمر خیّام کا انتقال ۱۱۲۳ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۳ برس تھی۔
- قدرتی کیمیائی عناصر میں سے ۷۳ عناصر سمندر کے پانی میں پائے جاتے ہیں۔
- ابنِ خلدون کا انتقال ۱۴۰۶ میں ۷۳ برس کی عمر میں ہوا۔
- دنیا کی سب سے کم حرارے والی سبزی ککڑی ہوتی ہے۔ جس کے ایک پونڈ میں صرف ۷۳ حرارے ہوتے ہیں۔
- پینسلین کے موجد الیگزینڈر فلیمنگ کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۳ برس تھی۔
- رقبے کے لحاظ سے برطانیہ دنیا کا ۷۳ واں بڑا ملک ہے۔
- آسٹریلیا کے خلاف پاکستان نے اپنا ایک روزہ بین الاقوامی میچ ۷ جون ۱۹۷۵ء کو پہلے عالمی کپ کے سلسلے میں کھیلا۔ یہ میچ آسٹریلیا نے ۷۳ رنز سے جیتا تھا۔

(۷۴)

- غرب الہند کے کلائیو لائیڈ نے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۵ء تک ۷۴ ٹیسٹ میچوں میں اپنی ٹیم کی کپتانی کی۔ جو ایک ریکارڈ ہے۔

- شیخ سعدی نے گلستان ۱۲۵۸ء میں مکمل کی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۴ برس تھی۔
- مصر میں اہراموں کی تعداد ۷۴ رہے
- کویت کی ۷۴ فیصد افرادی قوت غیر ممالک سے تعلق رکھتی ہے۔
- بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو کا انتقال ۱۹۶۴ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۴ برس تھی۔
- دیوارِ چین کے بعد دنیا کی دوسری طویل ترین دیوار دیوارِ ہیڈرین ہے۔ اس کی لمبائی ۷۴٫۶۵ میل ہے۔
- ہاکی کے مشہور کھلاڑی دھیان چند کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ۷۴ برس کی عمر میں ہوا۔
- چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، پولینڈ، تائیوان اور روس میں عورتوں کی اوسط عمر ۷۴ برس ہے۔ جبکہ دنیا میں مردوں کی اوسط عمر سب سے زیادہ جاپان میں ہے۔ وہاں کے مرد اوسطاً ۷۴٫۵۴ برس تک زندہ رہتے ہیں۔
- مشہور مسلمان سائنسدان ابن الہیثم کا انتقال ۱۰۳۹ء میں ہوا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۴ برس تھی۔

(۷۵)

- بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ۷۵ افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔
- ابنِ بطوطہ نے اپنی زندگی میں ۷۵ ہزار میل سفر کیا تھا۔
- ہیلی کا دمدار ستارہ ہر ۷۵٫۸۱ سال کے بعد نظر آتا ہے۔
- اکبر الٰہ آبادی کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔
- انگلستان کا آئن بوتھم پہلا کھلاڑی ہے جس نے ایک روزہ بین الاقوامی میچوں میں ڈبل کا اعزاز حاصل کیا۔ یعنی ۱۰۰۰ رنز بنائے اور سو وکٹیں حاصل کیں۔ اس نے یہ اعزاز ۷۵ میچوں میں حاصل کیا تھا۔
- انسانی بدن میں اتنی چربی ہوتی ہے کہ اس سے تقریباً ۷۵ موم بتیاں بنائی جاسکتی ہیں۔
- انگلستان کا کوئی بھی مقام ساحلِ سمندر سے ۷۵ میل سے زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔
- ۱۸۳۵ء میں جب ہیلی کا دمدار ستارہ نظر آیا تو اس برس مشہور امریکی مصنف مارک ٹوئن پیدا ہوا اور ۷۵ سال بعد جب ۱۹۱۰ء میں یہ ستارہ دوبارہ نظر آیا تو اسی شب اس کا انتقال ہوگیا۔
- مغربی برلن کا رقبہ مشرقی برلن کی بہ نسبت ۷۵ کلومیٹر زیادہ ہے۔
- تجارتی پیمانے پر دنیا کا پہلا ٹیلیوژن سیٹ جولائی ۱۹۲۸ء میں نیوجرسی کی ڈیون کارپوریشن نے فروخت کے لیے پیش کیا۔ اس سیٹ کی قیمت ۷۵ ڈالر تھی۔

# سانپ رے سانپ

ساجد سعید

اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ سانپ کے پیر نہیں ہوتے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ سانپ کی دوشاخہ زبان باہر نکلی رہتی ہے۔ کیونکہ سانپ اس کے ذریعے محسوس کرنے کا کام لیتا ہے۔ سانپوں کے جبڑے انسانوں کے جبڑوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے جبڑوں کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ جو مختلف زاویوں میں حرکت کر سکتے ہیں۔ زہریلے سانپوں کے دانتوں میں خول نما جگہ ہوتی ہے۔ جن کا رابطہ زہریلے غدودوں سے ہوتا ہے۔ جب زہریلے سانپ کسی انسان کو اپنے زہر کا نشانہ بناتے ہیں تو یہ غدود حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور یہ دانتوں کے خولوں میں زہر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ زہر اکثر انسان یا جانور کے بدن میں پہنچ کر اس کو ابدی نیند سُلا دیتا ہے۔ سانپ اپنی جلد بھی وقفوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جسے "کینچلی" کہتے ہیں۔

سانپ اکثر ہڈی والے جانور جنھیں سائنسی زبان میں Vertabrate کہا جاتا ہے۔ شکار کرتے ہیں اور عام طور پر اُن کے شکار میں، مینڈک، مچھلیاں، کیچوے، چڑیاں اور چھوٹے سانپ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ اپنے شکار کے گرد گھیرا ڈال کر اس کو ختم کر دیتے ہیں۔

دنیا میں ویسے تو سانپ کی سینکڑوں اقسام پائی جاتی ہیں لیکن اُن میں کوبرا، ایڈر، پائتھن، ٹیڑیا Rattle بہت مشہور سانپ ہیں۔ پائتھن سانپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی لمبائی ۳۰ فٹ تک ہوتی ہے اور یہ بیک وقت پورے چیتے یا بکری کو بھی نگل سکتا ہے۔ یہ اپنے شکار کے گرد بل ڈال کر اُسے مار ڈالتا ہے۔ کوبرا سانپوں میں سب سے خطرناک سانپ مانا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کو تنگ کرے تو وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بجلی کی تیزی سے اپنے شکار کو لقمۂ اجل بنالیتا ہے۔ کوبرا زیادہ تر جنوبی افریقہ اور ہندوستان اور برازیل کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ امریکہ میں پائے جانے والے سانپوں کی قسموں میں ایک سانپ ٹیڑیا Rattle بہت مشہور ہے۔ جس کی دُم سے چلتے وقت چکی چلنے کی آواز آتی ہے یہ دُم اس طرح بنتی ہے کہ ہر مرتبہ جب یہ سانپ اپنی جلد بدلتا ہے تو اس کی کھال کا کچھ حصّہ دُم سے لگا رہ جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ناہموار ہو کر چلتے وقت چکی کی سی آواز پیدا کرنے لگتی ہے۔

بے ضرر سانپ ہر انسان کو نقصان نہیں پہنچاتے اگر ان کو پالا جائے تو یہ بڑے دلچسپ ہو جاتے ہیں بالخصوص اطالیہ کے گھاس کے سانپ بے حد خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ سانپ کیڑے مکوڑے مکھیاں اور مختلف حشرات الارض کھاتے ہیں۔ گھاس میں رہنے والے کچھ سانپ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے منہ سے ایک مادّہ خارج کرتے ہیں جب یہ اس حالت میں ہوں تو اُن کو چھیڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ اُن کو فوری طور پر کسی شوکیس یا شیشے کے پنجرے میں رکھ دینا چاہیے۔ تاکہ یہ کسی کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ جب سورج نکل آئے تو اُن کے پنجروں کا رُخ سورج کی طرف کر دینا چاہیے۔ کیونکہ ان کو گرمی کی ضرورت رہتی ہے۔ انگلستان کا خطرناک سانپ ایڈر ہے جس کے جسم پر لہریا سا بنا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی دو فٹ تک ہوتی ہے اور سر پر ضرب کا نشان ہوتا ہے۔ ایڈر دُھوپ سینکنے کا بڑا شوقین ہوتا ہے، لیکن گھاس نما جگہوں میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ یہ اکثر پانی میں تیر کر مینڈک کو اپنا شکار بناتا ہے۔

افریقہ اور ہندوستان میں پانی کے سانپ بھی پائے جاتے ہیں پرانے زمانے میں اس کو Sea Serpent بھی کہا جاتا تھا لیکن محققین نے اس کو بلا جواز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بحری سانپ پائے جاتے ہیں وہ بہت زہریلے قسم کے ہوتے ہیں۔

سردیوں میں ہر مُلک کے سانپ زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں اور پورا موسم گزارنے کے بعد واپس آجاتے ہیں۔

# ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے اِنتخاب

## ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھّی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

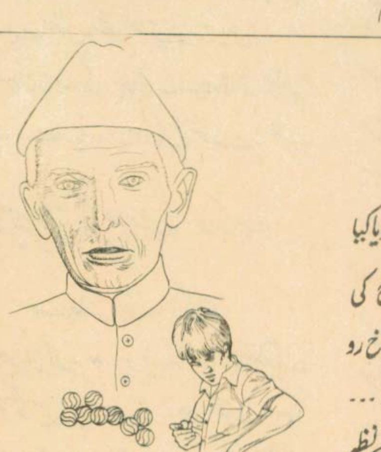

## اے روحِ قائد

مرسلہ :۔ لبنیٰ زیدی، انچولی - کراچی

ایک سال اور بیت گیا اور ہم نے کیا کھویا کیا نہیں ہوا بلکہ وہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ملّاح کی طرح سمندر کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سُرخ رو ہو کر پار اُترنے کی کوشش میں مصروف رہے ...

قائدِاعظم رح نہ صرف اعلیٰ قانون دان اور بے نظیر

پایا، ہمیں بیتے ہوئے دکھوں اور غموں کو بھلا کر آنے والے دنوں کی خوشیوں کا استقبال کرنا ہے۔

جب قائدِ اعظم برطانیہ سے وکالت کی ڈگری لے کر ہندوستان پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ہم وطن غیروں کی ظلم کی چکی میں بُری طرح پس رہے ہیں ۔ انہیں شدید دُکھ پہنچا ۔ آپ نے تہیّا کر لیا کہ ان کی محرومیوں کا ازالہ کریں گے ۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کے دلوں میں ناامیدی کے سائے بہت گہرے ہو چکے ہیں ۔ قائدِ اعظم نے ان کے دلوں میں آزادی کا جوش پیدا کیا ۔ آزادی کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انھیں آگاہ کیا ۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو اپنے حوصلے بلند کرنے ہوں گے ۔ ہم آخری وقت تک ہار نہ مانیں گے ۔ سب سے پہلے آپ لوگ تعلیم کی طرف توجہ دیں ۔ جو عقل و شعور کے دروازے کھولنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ اور جو ذہن میں اُجالے بکھیر دیتی ہے ۔ وقت کو اپنے عقل و شعور کا قیدی بنا لیں ۔

مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے قائدِ اعظمؒ کی ذات سے زیادہ موزوں کوئی شخصیت نہ تھی ۔

## میجر محمّد اکرم (شہید ۔ نشانِ حیدر)

محمد ظفر ایوب ۔ کراچی

میجر محمّد اکرم ۴ ، اپریل ۱۹۳۸ء کو ضلع گجرات کے قصبہ ڈنگہ میں پیدا ہوئے ۔ ۱۳ ، اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وہ پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کر کے فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں شامل ہوئے اور ۷ ، جولائی ۱۹۶۸ء کو وہ سابق مشرقی پاکستان میں متعین ہوئے ۔ جہاں انھیں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک کمان سونپی گئی ۔

۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہونے کے بعد وہ ہلّی محاذ کے اگلے علاقے میں جہاں ہندوستان نے زبردست دباؤ ڈال رکھا تھا، اپنی کمپنی کی قیادت کر رہے تھے ۔ دشمن کی فضائیہ اس کے توپ خانے اور بکتر بند دستوں کی لگاتار یلغاروں کی زد میں رہتے ہوئے میجر اکرم کی کمپنی نے دشمن کے ہر وار کو روکے رکھا اور اُن کو پاکستان کی سرزمین پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا ۔ ایک موقعے پر تو دشمن بھرپور حملے کے ارادے سے پورے بریگیڈ کی نفری لے کر جس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا ۔ اس کمپنی پر چڑھ آیا ۔ مگر تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دشمن کی برتری کے باوجود میجر اکرم اور اُن کے جیالے جوانوں نے دشمن کو نہ صرف دو ہفتے تک وہیں روکے رکھا بلکہ بھاری جانی نقصان پہنچاتے ہوئے اس کے ہر دھاوے کو پسپا کر دیا ۔ میجر اکرم بے مثال استقامت سے آخر دم تک لڑتے رہے ۔ اور اس یادگار معرکہ میں انھوں نے اپنے فرض کی تکمیل میں جس بانکپن سے نذرانۂ جان پیش کیا وہ افواجِ پاکستان کی تاریخ میں ایک لازوال سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے ۔

# ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

## ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

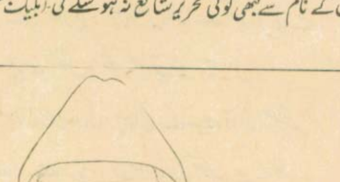

## اے روحِ قائد

مرسلہ: لبنیٰ زیدی، انچولی - کراچی

ایک سال اور بیت گیا اور ہم نے کیا کھویا کیا نہیں ہوا بلکہ وہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ملّاح کی طرح سمندر کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سُرخ رو ہو کر پار اُترنے کی کوشش میں مصروف رہے ...

قائداعظمؒ نہ صرف اعلیٰ قانون دان اور بے نظیر

پایا، ہمیں بیتے ہوئے دکھوں اور غموں کو بھلا کر آنے والے دنوں کی خوشیوں کا استقبال کرنا ہے۔

جب قائداعظم برطانیہ سے وکالت کی ڈگری لے کر ہندوستان پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ہم وطن غیروں کی ظلم کی چکی میں بُری طرح پس رہے ہیں ۔ انہیں شدید دُکھ پہنچا ۔ آپ نے تہیا کر لیا کہ ان کی محرومیوں کا ازالہ کریں گے ۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کے دلوں میں ناامیدی کے سائے بہت گہرے ہو چکے ہیں ۔ قائدِاعظم نے ان کے دلوں میں آزادی کا جوش پیدا کیا آزادی کی اہمیت اور قدر وقیمت سے انھیں آگاہ کیا ۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو اپنے حوصلے بلند کرنے ہوں گے ۔ ہم آخری وقت تک ہار نہ مانیں گے ۔ سب سے پہلے آپ لوگ تعلیم کی طرف توجہ دیں ۔ جو عقل وشعور کے دروازے کھولنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ اور جو ذہن میں اُجالے بکھیر دیتی ہے ۔ وقت کو اپنے عقل وشعور کا قیدی بنا لیں ۔

مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے قائدِاعظمؒ کی ذات سے زیادہ موزوں کوئی شخصیت نہ تھی ۔

## میجر محمّد اکرم (شہید ۔ نشانِ حیدر)

محمد ظفر ایوب ۔ کراچی

میجر محمد اکرم ۴ ، اپریل ۱۹۳۸ء کو ضلع گجرات کے قصبہ ڈنگہ میں پیدا ہوئے ۔ ۱۳ ، اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وہ پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کر کے فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں شامل ہوئے اور ۷ ، جولائی ۱۹۶۸ء کو وہ سابق مشرقی پاکستان میں متعین ہوئے ۔ جہاں انھیں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک کمپنی سونپی گئی ۔

۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہونے کے بعد وہ ہلی محاذ کے اگلے علاقے میں جہاں ہندوستان نے زبردست دباؤ ڈال رکھا تھا، اپنی کمپنی کی قیادت کر رہے تھے ۔ دشمن کی فضائیہ اس کے توپ خانے اور بکتر بند دستوں کی لگاتار یلغاروں کی زد میں رہتے ہوئے میجر اکرم کی کمپنی نے دشمن کے ہر وار کو روکے رکھا اور اُن کو پاکستان کی سرزمین پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا ۔ ایک موقعے پر تو دشمن بھرپور حملے کے ارادے سے پورے بریگیڈ کی نفری لے کر جس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا ۔ اس کمپنی پر چڑھ آیا ۔ مگر تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دشمن کی برتری کے باوجود میجر اکرم اور اُن کے جیالے جوانوں نے دشمن کو نہ صرف دو ہفتے تک وہیں روکے رکھا بلکہ بھاری جانی نقصان پہنچاتے ہوئے اس کے ہر دھاوے کو پسپا کر دیا ۔ میجر اکرم بے مثال استقامت سے آخر دم تک لڑتے رہے ۔ اور اس یادگار معرکہ میں انہوں نے اپنے فرض کی تکمیل میں جس بانکپن سے نذرانۂ جان پیش کیا وہ افواجِ پاکستان کی تاریخ میں ایک لازوال سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے ۔

# میرا اسکول

عمر خطاب خان، اورنگی ٹاؤن کراچی

مجھے اپنا اسکول ہے دِل سے پیارا
اس نے مری زندگی کو سنوارا
میں اس سے ہمیشہ محبّت کروں گا
میں اس کی صدا دِل سے عزّت کروں گا
نہ کیوں مجھ کو اسکول سے ہو محبّت
اسی نے دکھائی مجھے راہِ اُلفت
سُنا ہے بزرگوں سے یہ قول اکثر
کہ تعلیم انسان کا ہے اصل زیور
خدایا مجھے اتنی ہمّت عطا کر
کہ پھیلاؤں دنیا میں میں علم گھر گھر

# دیانت داری

علاؤالدّین - مردان

احمد خان ایک بہت دیانتدار شخص تھا سارے گاؤں میں اُس کو عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُس نے محنت اور ایمانداری سے اپنی زندگی بہت سکون سے گزاری تھی۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی جوان بیٹی گھر میں بیٹھی تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ لیکن قدرت نے اُسے یہ موقع نہیں دیا اور وہ دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہو گیا۔ اُس نے مرتے وقت اپنے بیٹے کمال کو وصیت کی کہ اپنی بہن کا بیاہ جلد سے جلد کر دینا۔

کمال نے اپنے باپ کی آخری خواہش کا پورا پورا خیال رکھا اور اُس کا رشتہ ایک بہت ہی اچھے خاندان میں کیا۔ اب مسئلہ جہیز کا تھا۔ کمال کے پاس جہیز کے لیے رقم کا آدھا حصہ موجود تھا۔ اور اُسے امید تھی کہ باقی رقم بھی جلد سے جلد کہیں سے حل جائے گی۔

اسی امید کی ایک کرن اُسے اپنے تھانیدار شاہد کے پاس لے گئی۔ کمال نے جب اُس سے اس مسئلہ پر بات کی تو اُس نے دس ہزار روپے قرض دے دیئے۔ دو دن بعد شاہد کے ہاتھوں ملک کا ایک بہت ہی خطرناک مجرم گرفتار ہو گیا۔ مجرم نے شاہد کو جب بیس ہزار دکھائے تو اُس کی نیت بدل گئی اور اُسے چھوڑ دیا۔ کمال ایک ایماندار سپاہی تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا تو اُس کے ضمیر نے اُسے چُپ رہنے کی اجازت نہ دی۔ اُس نے سوچا کہ کسی بڑے افسر سے بات کر لینی چاہیے۔

چنانچہ وہ ایس پی خٹک کے پاس چلا گیا۔ اور سارے واقعات سے اُسے آگاہ کیا۔ ایس پی خٹک نے تھانیدار شاہد کو بلایا اور اُس سے کہا کہ "چلو اس رشوت میں ہمارا حصّہ بھی نکالو" اور طنزیہ لہجہ میں کہا کہ "کمال کو بھی ایمانداری کا انعام دو"... چنانچہ تھانیدار شاہد نے رشوت کا آدھا حصّہ ایس پی کو دے دیا اور جو دس ہزار روپے کمال نے شاہد سے قرض لیے تھے۔ اُس پر کیس جاری کیا کہ وہ دس ہزار روپے رشوت کے ہیں جو اُس نے مجُرم سے لے کر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ کمال کو دس سال قیدِ بامشقّت کی سزا ہو گئی۔

"یہ ہے صلہ آج کل کے دور میں ایمانداری کا"

## دلچسپ پہیلی

سیّد یوسف نصراللہ۔ ڈیفنس کراچی

ہم نے دیکھا ہے اک پودا
سب سے الگ اور سب سے انوکھا

باغ میں اُس کا کام نہیں
کھیت میں اُس کا نام نہیں

اتنی اونچی شاخ ہے اُس کی
انسانوں کے منہ تک پہنچی

پانی دینے سے لہرائے
بھُوک لگے تو آگ بھی کھائے

سب سے جُدا ہے اس کی نشانی
اوپر آگ اور نیچے پانی

جان اس کی اِک بانس میں دیکھی
گڑگڑ اس کی سانس میں دیکھی

نکلا دھواں اِک سانس جو لے لی
بچّو بُوجھو تم یہ پہیلی!!

جواب:۔ حُقّہ

## قبلائی خان

محمد سلمان خان سنبل بوریوالہ

قبلائی خان چنگیز خان کا پوتا تھا۔ وہ ۱۲۱۶ء میں پیدا ہوا اور بعد میں اتنی وسیع سلطنت کا حکمران بن گیا کہ اس سے پہلے کسی بادشاہ کو اتنے لوگوں پر حکومت کرنا نصیب نہ ہوا تھا۔ جب چین میں مُغلوں کو مار دھاڑ کرتے آدھی صدی گزری تھی (۱۲۷۹ء) تو اُس وقت قبلائی خان کی بادشاہی کا پھریرا لہرایا

کی سرحدوں تک لہرا رہا تھا ۔ یورپ کے لوگوں کو سب سے پہلے جس چینی بادشاہ سے شناسائی حاصل ہوئی وہ قبلائی خان ہی تھا ۔ ابھی قبلائی خان کی عمر دس سال کی تھی کہ اُس نے اپنے دادا چنگیز خان کی آخری مہم میں حصّہ لیا ۔ یہ مہم ۲۷۔۱۲۲۶ء میں ہوئی ۔ روایت ہے کہ چنگیز خان نے اپنے بستر مرگ پر قبلائی خان کو لائق اور ہونہار بتایا تھا۔ قبلائی خان کہیں ۱۲۵۹ء میں جاکر تخت پر بیٹھا لیکن اس وقت بھی اُس کو اپنے بھائی "اریک بغا" اور اپنے چچازاد بھائی "قیدو" سے جنگ کرنی پڑی ۔ کیونکہ وہ بھی تخت کے دعویدار تھے ۔ قبلائی خان نے اُن پر فتح پائی اور اپنا نیا پایۂ تخت پیکن میں قائم کیا (۱۲۶۴ء) اسی کے بعد جنوبی چین پر قبضہ کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔

جب قبلائی خان زیادہ دُور دراز فوجی مہمیں اختیار کرتا تھا اُسے کامیابی نہ ہوتی تھی ۔ اُس نے جاپان پر کئی حملے کیے لیکن شدید ناکامی ہوئی ۔ پھر کوچین ، چائنا اور جاوا پر چڑھ دوڑا ۔ لیکن اُن میں بھی کامیابی نہ ہوئی ۔ البتہ برما میں کامیاب ہوا۔ اور مُغل فوجیں اس ملک میں ایراودی کے ڈیلٹے تک بڑھتی چلی گئیں ۔ اس شہنشاہ نے جب کبھی دوسرے ملکوں سے امن ومصالحت کی بات چیت کی، وہ ہمیشہ کامیاب ہوا ۔ مثلاً جنوبی ہندوستان مشرقی افریقہ اور مڈغاسکر نے اس کی اطاعت کا عہد کرلیا ۔ قبلائی خان کی فوج میں ایشیا کے اکثر ملکوں کے لوگ شامل ہوتے تھے اور اس کے عملے میں ہر ملک کے طالع آزما، جنگجو، سائنس داں حاکم اور سیاسی آدمی شریک تھے ۔ مارکو پولو اسی گروہ سے تھا اور ہمیں قبلائی خان کے اکثر حالات اسی کے سفرنامے سے معلوم ہوئے ہیں ۔ مارکو پولو نے یہ بھی لکھا ہے کہ قبلائی خان اپنی رعایا کی تعلیم کے لیے یورپ کے پادریوں کو بلانا چاہتا تھا لیکن جب وہ نہ ملے تو اس نے تبّت سے بُدھ مت والوں کو بلالیا ۔

قبلائی خان کا دربار نہایت شاندار تھا، جہاں عیش وتفریح کے عظیم الشان سامان موجود تھے ۔ اور اس کی شکار کی ٹولیاں ۔ بڑی آن بان کی ہوتی تھیں

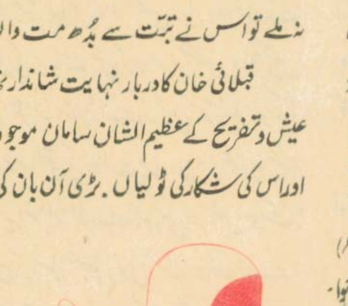

## علم بڑی دولت ہے

ضرغام راجہ ۔ ملیر کراچی

ایک روز بغداد کے بازار میں دو آدمیوں میں بحث چھڑ گئی ۔ دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے امیر ثابت کر رہے تھے ۔ آخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ چلو قاضی کے پاس چلتے ہیں وہ جو فیصلہ کرے گا اُسے قبول کرلیں گے ۔ انھوں نے طے کیا

کہ جو شخص کم دولت مند ثابت ہوگا وہ اپنی ساری دولت دوسرے شخص کو دے دیگا۔

دونوں افراد قاضی کے پاس پہنچے اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ قاضی نے دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، ایک شخص نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا جبکہ دوسرے کا لباس خستہ تھا۔

قاضی یہ دیکھ کر بولا "ظاہری طور پر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیمتی لباس والا شخص زیادہ دولتمند ہے۔"

قاضی کی یہ بات سُن کر دوسرا شخص بولا "نہیں قاضی جی میرا خزانہ اتنا بڑا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا جبکہ میرے ساتھی کی دولت چند دن میں ختم ہوسکتی ہے جبکہ میرا خزانہ علم ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔"

یہ سُن کر پہلا شخص بول اُٹھا "یہ غلط ہے میرے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اور میرے ساتھی کے علم کا خزانہ اُس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"

قاضی نے دونوں کی باتیں غور سے سُنیں اور اعلان کیا کہ اس مقدمے کا فیصلہ اگلے روز کیا جائے گا۔ یہ سُن کر دونوں افراد واپس اپنے گھر چلے گئے۔ اِدھر قاضی نے اپنے خاص آدمی سے کہا "جاؤ اور جاکر دونوں کی دولت یعنی ایک کا روپیہ اور دوسرے کی کتابیں اُٹھا لاؤ۔"

دوسرے روز جب قاضی کے سامنے دونوں افراد حاضر ہوئے تو قیمتی لباس والا چلاّ چلاّ کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"ہائے میں لُٹ گیا برباد ہوگیا۔ میری ساری دولت چوری ہوگئی۔" لیکن اس کے برعکس دوسرا خاموش کھڑا تھا۔

یہ دیکھ کر قاضی قیمتی لباس والے سے بولا "تم نے غلط دعویٰ کیا تھا تم ہار گئے تمہارا ساتھی جیت گیا، دولت تو اس کی بھی چوری ہوئی مگر پھر بھی وہ پُرسکون کھڑا ہے اس کا مطلب ہے اس کے پاس مزید دولت ہے جس کے چوری ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔"

یہ کہہ کر قاضی نے دونوں کی چیزیں منگوائیں اور دونوں کو دے دیں۔

اپنی دولت قاضی کے پاس دیکھ کر قیمتی لباس والا قاضی کی چال سمجھ گیا اور شرمندگی سے بولا "میں ہار گیا۔ واقعی علم کی دولت، روپے پیسے کی دولت سے زیادہ قیمتی ہے، میں اپنی ساری دولت اپنے ساتھی کو پیش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر قیمتی لباس والے نے اپنا سارا مال اپنے ساتھی کو پیش کیا۔ مگر اس شخص نے دولت خود لینے کے بجائے تمام روپیہ مدرسوں پر خرچ کرنے کا اعلان کر دیا اور پھر مُسکراتا ہوا اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

## خدا ہر جگہ موجود ہے

کریم قاسم علی، امین آباد، کراچی

حضرت جُنید بغدادی ایک بزرگ اُستاد تھے۔ جن سے بڑی تعداد سے شاگرد علم حاصل کرتے تھے۔ اُن کا ایک شاگرد بہت ذہین تھا۔ اس کے دل میں مکمّل اور مضبوط ایمان تھا۔ کہ اللہ ہر جگہ موجود، حاضر ناظر ہے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف بھی تھا۔

حضرت جنید اُس شاگرد پر اسی لیے خاص طور پر مہربان تھے۔ یہ بات دوسرے طالب علموں کو پسند نہ تھی۔ آخر ایک روز تمام شاگردوں نے اُستاد سے شکایت کی۔ وہ بھی ہماری طرح ایک طالب علم ہے۔ آپ اُس پر اس قدر زیادہ مہربان کیوں ہیں؟ حضرت جنید نے جواب دیا۔

"میرا یہ شاگرد شائستہ باادب اور ذہین ہے۔ میں کسی دن اس کا امتحان لے کر تمہاری تسلّی کرادوں گا۔"

ایک دن حضرت جنید نے شاگردوں کو ایک ایک مُرغی اور ایک چھُری دے کر کہا کہ "مُرغی کو ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔" ہر شاگرد اپنی مُرغی کو کسی ایسی جگہ ذبح کر کے لے آیا جہاں کوئی نہ تھا۔ لیکن ذہین شاگرد اپنی مُرغی زندہ ہی لے آیا۔ حضرت جُنید نے اُس سے سوال کیا۔

"تم نے اپنی مُرغی کیوں ذبح نہیں کی؟" اُس نے جواب دیا۔

"مجھے ذبح کرنے کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں ملی، جہاں خدا حاضر اور موجود نہ تھا۔ خدا مجھے ہر جگہ دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں یہ مُرغی زندہ لے آیا ہُوں۔" یہ سُن کر حضرت جُنید نے شاگردوں سے کہا۔

"تم سب نے دیکھ لیا کہ یہ شاگرد تم سب سے زیادہ سمجھدار، ذہین اور صاحبِ ایمان ہے، اسی لیے میں اسے عزیز رکھتا ہوں۔"

## معلومات ذہنی آزمائش

امجد حسین ثانی، لانڈھی کراچی ۲۳

۱۔ پاکستان میں ہوائی اڈّوں کی کل تعداد کتنی ہے؟

۲۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کی کنیت بتا دیجیے؟

۳۔ پاکستان کا پہلا اسپورٹس کمپلیکس کب اور کہاں قائم ہوا؟

۴۔ سورۃ رحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن کتنی مرتبہ آیا ہے؟

۵۔ پاکستان کی پہلی خبر رساں ایجنسی کا نام بتایئے؟

۶۔ آنکھ مچولی میں سرورق کے ساتھ کتنے صفحے ہوتے ہیں۔ جلدی سے بتایئے؟

۷۔ لفظ اوّل کی جمع بتا دیجیے؟

۸۔ کرکٹ کی اصطلاح میں وہ کون سا لفظ ہے جس کو اگر اُلٹا کر دو تو پھر بھی وہی لفظ پڑھا جائے گا؟

۹۔ وہ کون سا کھلاڑی ہے جس نے تین اوور میں سینچری مکمل کی؟

۱۰۔ ہاکی میں ڈبل ہیٹ ٹرک بنانے والے کھلاڑی کا نام بتایئے؟

جوابات:۔ ۱۔ (۲۳) ۲۔ ابو سلیمان

۳، کراچی میں ۱۶، جنوری ۱۹۷۴ء کو ۴، ۳۱، مرتبہ
۵، نیوز ٹرسٹ آف پاکستان ۶، ۱۲۰ ۷، اوائل
۸، ڈیڈ ۹، سر ڈان بریڈمین ۱۰، حسن سردار

# واپسی

مرسلہ - حاجی خان شاہ زیب - کنری

ایک غریب افریقی کسان بہت لمبا سفر کر کے بہت دُور کسی شہر میں پہنچا۔ وہ یہاں اس لیے آیا تھا کہ اپنے گاؤں میں اُس کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ کسی بڑے شہر میں جا کر کوئی کام کاج کرے۔ اس طرح اس کی غربت دُور ہو جائے گی اور وہ امیر آدمی بن جائے گا۔

شام کے وقت وہ شہر کے قریب آیا تو یہاں کچھ کھیت تھے۔ کھیتوں میں بہت سی گائیں چر رہی تھیں اتنی بہت سی گائیوں کو ایک جگہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا۔ اتنی گائیوں کا مالک کون ہوگا۔ اتنے میں وہاں سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ کسان نے اُس سے پوچھا، ان گائیوں کا مالک کون ہے؟

وہ شخص کسان کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اُس نے کہا (مینو) جس کا مطلب ہے میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا۔

کسان سمجھا کہ سب گائیوں کا مالک کوئی مینو نامی شخص ہے۔ پھر تو یہ مینو بہت امیر آدمی ہوگا۔۔۔

غریب نے جب شہر کی اونچی عمارتیں دیکھیں تو اُس نے سوچا، اتنی بڑی بڑی عمارتوں کا مالک کون ہو سکتا ہے۔ اُس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا، ان عمارتوں کا مالک کون ہے۔ (مینو) اُس آدمی نے بھی یہی جواب دیا کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھتا۔

ارے! اتنی بڑی عمارتوں کا مالک بھی مینو ہے، کسان نے کہا اور آگے چل دیا۔

اب اُس نے ایک بڑا اور خوبصورت ہوٹل دیکھا۔ ہوٹل کے سامنے خوبصورت باغیچہ اور بڑے بڑے درخت بھی تھے۔ اتنا عظیم ہوٹل دیکھ کر کسان رُک گیا۔ اتنے میں ہوٹل میں سے چند لڑکیاں نکلیں۔ پہلے تو کسان انہیں دیکھ کر جھینپ گیا پھر ہمت کر کے ایک لڑکی سے پوچھا اے محترمہ یہ ہوٹل کس کا ہے۔

لڑکی پہلے تو اُسے دیکھتی رہی پھر بولی "مینو"

جو تحریریں آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ
نہ کریں۔

میرے خدایا! کسان نے کہا اتنے بڑے ہوٹل کا مالک بھی مینو ہے۔ مینو تو ضرور کروڑپتی ہے۔ تبھی اتنی گاڑیں، اتنی بڑی بڑی عمارتیں اور بہت بڑا ہوٹل بھی اس کا ہے. گھومتے گھامتے کسان بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں پر ایک بہت بڑا جہاز کھڑا تھا جسے دیکھ کر کسان نے جہاز پر چڑھتے ہوئے مسافر سے پوچھا "یہ جہاز کس کا ہے"؟ وہ آدمی کچھ دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر معذرت سے بولا "مینو" کسان حیران رہ گیا پھر بڑبڑانے لگا "یہ اتنا بڑا جہاز بھی مینو کا ہے۔ سارے شہر کا مالک مینو ہے۔ اتنا امیر مینو۔ بادشاہ جتنا امیر مینو۔ عظیم مینو، عظیم مینو" کسان یہ کہہ کر چل دیا، ابھی وہ کچھ ہی آگے گیا ہوگا کہ ایک جنازہ دیکھا "بیچارہ مر گیا" کسان نے دل میں سوچا، پھر وہ آگے بڑھا اور جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "اے بھیّا یہ جنازہ کس کا ہے۔ اس شخص نے بھی پہلے تو کسان کو غور سے دیکھا پھر بولا "مینو" "ارے ارے مینو مر گیا! اتنا عظیم، اس قدر امیر آدمی مر گیا۔ سینکڑوں گاڑیوں کا مالک، بہت ہی عالیشان عمارتوں، اتنے بڑے ہوٹلوں اور بحری جہازوں کا اکیلا مالک چل بسا۔ یہ ساری جائیداد، اربوں روپے کا سامان اُسے موت سے نہ بچا سکا۔ پھر اُس دولت کا کیا فائدہ، ایسی دولت کو میں کیا کروں گا" کسان نے اپنے آپ سے کہا اور سوچا میں آئندہ اپنی جھونپڑی اور محنت ہی پر قناعت کروں گا۔ یہ کہتا ہوا وہ واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

# اچھّی باتیں

عبدالستّار آثم، سرگودھا

جاگو اے پیارے بچّو جاگی ہے کُل خُدائی
مِل کر بیاں کرو سب اللہ کی بڑائی
یاد اُس خدا کو کر لو، جو خالقِ جہاں ہے
پھر ناشتے میں کھاؤ تم دُودھ اور ملائی
فرمان ہے نبیؐ کا سب دِل لگا کے پڑھنا
پڑھتے رہو ہمیشہ پڑھنے میں ہے بھلائی
منزل ہے یہ تمھاری بَن جاؤ باادب تم
جو بے ادب رہا ہے منزل نہ اُس نے پائی
توڑو نہ دِل کسی کا، یوں مہرباں بنو تم!

آپس میں مت لڑو تم بن جاؤ بھائی بھائی
اپنے وطن کی عظمت آئم بڑھاؤ ہر دم
پیشِ نظر ہمیشہ ہو قوم کی بھلائی۔

# عقل مند خلیفہ

خرم شہزاد - ماخوذ (انگلش کی ساتویں کتاب سے)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام ہارون تھا اور دوسرے کا نام ظفر تھا۔ اُنھیں اپنے گاؤں میں کوئی کام کرنے کو نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ اُن دونوں نے شہر جاکر کمائی کرنے کے بارے میں سوچا۔ اگلی صبح دونوں شہر کی طرف چل پڑے۔ ہارون کے پاس تین روٹیاں تھیں اور ظفر کے پاس پانچ روٹیاں۔ چلتے چلتے آخر کار وہ شہر کی حدود میں داخل ہوگئے۔ اب وہ دونوں بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ چنانچہ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ جب اُن کی آنکھ کھلی تو اُنھیں بھوک نے ستایا۔ چنانچہ جیسے ہی اُنھوں نے کھانا کھانا شروع کیا تو اُنھیں اپنے سامنے ایک سوار نظر آیا۔ انھوں نے سوار کو سلام کیا اور کہا کہ مہربانی فرماکر آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوجائیے۔ جب وہ تینوں کھانا کھا چکے تو سوار نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُن دونوں کو سونے کی آٹھ اشرفیاں دیں اور کہا یہ ایک بھائی کی طرف سے تحفے کی صورت میں قبول کرو۔

یہ کہہ کر وہ سوار اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ دونوں دوست بہت خوش ہوئے۔ ہارون نے ظفر سے کہا "چلو آپس میں یہ اشرفیاں بانٹ لیتے ہیں۔ چار اشرفیاں تم لے لو اور چار اشرفیاں میں لے لیتا ہوں۔۔۔"

یہ سُن کر ظفر نے کہا: "میری پانچ روٹیاں تھیں اس لیے میں پانچ اشرفیاں لوں گا۔ اور تمھاری تین روٹیاں تھیں۔ اس لیے تم تین اشرفیوں کے حق دار ہو۔" ہارون نے جل بھُن کر کہا۔

"ہم اپنا مقدمہ خلیفہ کے پاس لے کر جائیں گے۔" ظفر مان گیا۔ دونوں خلیفہ کے پاس چل پڑے۔ انھوں نے خلیفہ کو سارا معاملہ سُنایا۔ خلیفہ کچھ دیر تک خاموش رہے اور پھر بولے۔

"ہارون کو ایک اشرفی ملے گی اور ظفر کو سات اشرفیاں ملیں گی۔" خلیفہ کا فیصلہ سُنتے ہی ہارون نے چلاّ کر کہا۔

"اے عقل مند خلیفہ! یہ کیسا انصاف ہے؟" خلیفہ نے ہارون سے کہا۔

"خاموش ہو جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ تم دونوں کے پاس کُل آٹھ روٹیاں تھیں۔ اگر ہم ہر روٹی کے تین حصے کریں تو آٹھ روٹیوں کے چوبیس حصے بنیں گے۔ تم میں سے ہر ایک نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے۔ ہارون تمھارے پاس صرف تین روٹیاں تھیں اور تمھاری روٹیوں کے نو ٹکڑے بنے

تم نے آٹھ ٹکڑے خود کھائے اور ایک ٹکڑا سوار کو دیا۔ اس لیے تم ایک اشرفی کے حق دار ہو۔ ظفر تمہارے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور ان پانچ روٹیوں کے کُل پندرہ ٹکڑے بنے۔ تم نے آٹھ ٹکڑے خود کھائے اور سات ٹکڑے سوار کو دیے۔ اس طرح تم سات اشرفیوں کے حق دار ہو۔ اس طرح خلیفہ نے یہ معاملہ اپنی عقل مندی کی وجہ سے حل کر دیا۔ اگر ہم بھی عقل مندی سے کام لیں تو مشکل سے مشکل مسائل آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔

# وقت

مظفر احمد راجہ - ڈیرہ غازی خان

انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے شب و روز دنیا کی مصروفیات یہ احساس نہیں ہونے دیتیں کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ جو لوگ وقت کا احساس کر لیتے ہیں وہ ایک پروگرام کے مطابق اپنی زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وقت میں ایک عجیب و غریب لچک ہے۔ جن لوگوں نے وقت کو سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ ان کا تجربہ ہے کہ وقت پھیل جاتا ہے اور وہ ایسے کام کر گزرتے ہیں کہ اُن کے کارناموں کو دیکھ کر سُست اور کاہل لوگ حیران ہوتے ہیں کہ ان مشہور ہستیوں نے اپنی چند روز زندگی میں کتنے بڑے بڑے یادگار کارنامے کس طرح سرانجام دیئے۔ ان کے مقابلے میں جو وقت ضائع کرتے ہیں۔ یا کسی مقصد کے تحت زندگی نہیں گزارتے۔ اُن کا وقت سمٹ جاتا ہے۔ اُن پر وقت کا خوف طاری رہتا ہے اور وہ ایک ناکام اور پریشان زندگی گزارتے ہیں۔

ایک فلسفی کا قول ہے۔ اگر تمھیں زندگی سے محبت ہے تو وقت برباد نہ کرو۔ کیونکہ زندگی وقت سے ترکیب پاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زندگی میں سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ اس کے بارے میں لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے۔ دنیا کی مادی چیزیں دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن گزرا ہوا لمحہ کبھی اور کسی قیمت پر واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ہم غفلت کا شکار نہ ہوں

اپنی نگارشات
صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر
لکھیں۔

اور اپنے وقت کا نہایت عمدگی سے استعمال کریں۔

وقت کا عمدہ استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وقت کا بہترین اور بامقصد استعمال باقاعدہ منصوبہ بندی کا محتاج ہے۔ ہر کام جو کسی پروگرام کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے۔ وہ احسن طریقے سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے ٹائم ٹیبل مرتب کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہر کام مرحلہ وار مدارج سے گزرتا ہے۔ اور وہ متعین کردہ وقت کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کے نتائج بھی خاطر خواہ برآمد ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ ٹھوس اور مادی اشیاء کی بڑی حفاظت کرتے ہیں مگر زندگی کی دوڑ میں انھیں وقت کا احساس نہیں رہتا۔ وقت ٹھوس یا مادی شے نہیں۔ اس لیے وقت کے بارے میں عام بے پرواہی برتی جاتی ہے۔ بہتے ہوئے پانی کو روکا جاسکتا ہے مگر گزرنے والے وقت کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اور یہی اس کی فطرت ہے اس لیے دانش مندی کا تقاضا ہے کہ وقت کی تباہی سے پہلے اس کو ایک پروگرام کے تحت بھرپور انداز میں اپنے تصرف میں لایا جائے۔ اور وقت کی پابندی ہی ایک ایسا حربہ ہے جو وقت کی تباہی کو روکنے میں مدد دیتا ہے۔

طالب علم وہی کامیاب ہوتا ہے جو وقت کی اہمیت جانتا ہو۔ اور اپنے کام میں بالکل مخلص ہو۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑے۔ جو ایسا کرتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ آنے والے کل کا کام کب کریں گے۔ ایسے طالب علم وقت ٹالنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وقت تو بلاشبہ ٹل جاتا ہے مگر اُن کا کام وہیں کا وہیں دھرا رہتا ہے۔ وہ اس فکر سے کہ اب یہ کام کیسے ہوگا۔ نفسیاتی طور پر کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان پر مایوسی غلبہ پا لیتی ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی طبیعت میں گریز اور فرار کا رجحان پیدا ہونے لگتا ہے وہ کھیل کود اور آوارہ گردی میں کھو جاتے ہیں۔ اور اپنے نصب العین سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

فطرت میں بھی وقت کی تقسیم اور اس کی پابندی کا اصول کارفرما ہے۔ مختلف موسموں کی تبدیلی وقت کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر قدرت وقت کی پابند نہ رہے تو فطرت کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ چاند اور سورج کا طلوع و غروب سردی، گرمی، بہار و خزاں مخصوص وقت کے پابند ہیں۔

## معلوماتِ کرکٹ

۱۔ پہلا ورلڈ کپ کب اور کہاں ہوا تھا؟

۲۔ پاکستان نے سب سے پہلا میچ کس سے کھیلا تھا؟

۳۔ بلّے باز کتنے طریقوں سے آؤٹ ہو سکتا ہے؟

۴۔ کرکٹ کی گیند کی چوڑائی کتنے سینٹی میٹر ہوتی ہے اور اس کا وزن کتنے اونس ہوتا ہے؟

۵۔ بلّے کی لمبائی کتنے انچ ہوتی ہے اور اس کی چوڑائی کتنے انچ ہوتی ہے؟

## جوابات

۱۔ ۱۹۷۵ء میں انگلستان میں ۲۔ ۷، جون آسٹریلیا کے خلاف ۳۔ نو طریقوں سے ۴۔ چوڑائی ۹، سینٹی میٹر وزن ۱۵، اونس ۵۔ بلّے کی لمبائی ۷، ۳۔ ۳۸، انچ ہوتی ہے اور چوڑائی ۲۵۔ ۴ انچ ہوتی ہے۔

یاسر فیروز، کراچی

## قرآن مجید ایک نظر میں

مسعود عالم برقی، کراچی

۱۔ قرآن مجید میں کُل ۱۱۴، سورتیں ہیں (۸۷، مکی اور ۲۷، مدنی)

۲۔ قرآن مجید میں کُل ۶۲۳۶ آیات ہیں۔

۳۔ قرآن مجید میں کُل ۱۴، سجدے ہیں۔

۴۔ قرآن مجید میں کُل ۵۵۸ رکوعات ہیں۔

۵۔ سب سے پہلی سورۃ مکّہ میں نازل ہوئی۔

۶۔ سب سے آخری سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی۔

۷۔ آخری پارہ (عمّ) میں سب سے زیادہ رکوعات ہیں (۳۹، رکوعات)

۸۔ قرآن مجید میں کُل ۳۰، پارے ہیں۔

۹۔ قرآن مجید میں رکوعات اور آیات کے لحاظ سے سورۃ البقر سب سے بڑی سورۃ ہے۔

۱۰۔ سورۃ "عصر" سورۃ "الکوثر" اور سورۃ "نصر" آیات کے لحاظ سے سب سے چھوٹی سورتیں ہیں۔

۱۱۔ ترتیب نزول اور ترتیب تلاوت دونوں کے لحاظ سے سورۃ "نوح" کا ۷۱ واں نمبر ہے۔

۱۲۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے پہلی سورۃ "سورۃ الفلق" اور آخری "سورۃ النصر" ہے۔

آنکھ مچولی کے گزشتہ شمارے میں ننھّی نگارشات پر شائع ہونے والی نظم "ہم سب کا ایک ہی نعرہ ہے" محترمہ تبسم کی تخلیق ہے۔

## بلیک بکس

آنکھ مچولی کے قہقہہ نمبر میں **محمّد رضوان** (کراچی) کی شائع ہونے والی کہانی "ایک دن بکرا پیڑھی میں" نقل شدہ ہے۔ یہ کہانی "بکرے کی تلاش" کے عنوان سے پہلے ہی ایک رسالے میں شائع ہو چکی ہے۔ ایک قاری علی گوہر کی اطلاع پر ادارہ نے اس کی تصدیق کی اور اب نہایت رنج و افسوس کے ساتھ محمّد رضوان کا نام بلیک بکس میں شائع کیا جا رہا ہے

# سالگرہ کے ساتھی

امین رشید، ہشتم
۱۱ ستمبر ۱۹۷۵ء
انگریزی۔ ماں باپ کا
ہاتھ بٹانا، قانون دان بننا چاہتے ہیں۔
۸۔ اسلامک ٹاؤن چشتیاں ضلع بہاولنگر

کاشف رضوان، چہارم
۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء
سائنس، کرکٹ کھیلنا
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔
خانزادہ سیمنٹ ایجنسی دوڑ رضوان کو ملے

ریاض احمد خانزادہ، ہشتم
۲۱ ستمبر ۱۹۷۴ء
آنکھ مچولی پڑھنا، بیالوجی
فوجی افسر بنیں گے۔ نزد عاشق بیکری
شکیل جنرل اسٹور کومل کمرہ ریاض روڈ

عبدالعلیم اشرف، نہم
۷ ستمبر ۱۹۷۴ء
کمپیوٹر سٹڈیز، فٹبال اور
کرکٹ، قلمی دوستی۔ ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔
۲۵ بی (۴) سرکلر روڈ یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور

محمد زید اقبال، ہشتم
۴ ستمبر ۱۹۷۶ء
کرکٹ، مطالعہ، ریاضی
سائنس ڈاکٹر بنیں گے۔ محمد زاہد اقبال
ولد محمد اقبال ۶۰/ الف حاصل پور، بہاولپور

محمد آصف درویش۔ دہم
۴ ستمبر ۱۹۷۵ء
آنکھ مچولی پڑھنا، کمپیوٹر
سیکھنا، انگریزی۔ ڈاکٹر بنیں گے۔
عرشی اسکوائر، بزنس روڈ بلاک اے۔ فرسٹ فلور کراچی

محمد رمضان شاہد، دہم
۱۲ ستمبر ۱۹۷۶ء
سائنس۔ بیڈمنٹن کھیلنا
ڈاکٹر بننے کا شوق ہے۔ محمد رمضان شاہد
افغان اینڈ کو رسی اسٹاک کریانہ مرچنٹ محلہ امیر کوٹ سرکلر روڈ بہاولنگر

محمد عمران عباسی، ہشتم
۶ ستمبر ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی، انگلش،
انجینئر بننا چاہتے ہیں مکان نمبر ۱۶
گلی نمبر ۲، وارڈ نمبر ۱۲ ٹبہ نور پورہ ہارون آباد

بشارت عرفان، دہم
۵ ستمبر ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی، انگلش،
ڈاکٹر بنیں گے۔ معرفت اکرم فوٹو اسٹوڈیو
شاہین مارکیٹ، حافظ آباد

عامر تاج ، ششم
۹ ستمبر ۱۹۷۷ء
ٹکٹ جمع کرنا، کرکٹ
انگریزی، ڈاکٹر بننا پسند کرتے ہیں
۲۱۔ ڈی۔ ایدرہ روڈ یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور

عبید الرحمٰن ذیشان، ہفتم
۷، ستمبر ۱۹۷۷ء
آنکھ مچولی پڑھنا، اسلامیات
فوجی بنیں گے۔ بفرزون نارتھ کراچی (پاکستان)
۲، اے۔ ۱۵/ ۲۹۲، آر

شمس الحق قدانی، دہم
۳۱، ستمبر ۱۹۷۴ء
آنکھ مچولی پڑھنا، ریاضی
کیمسٹری، پائیلٹ بنیں گے۔ قدانی ٹریڈرز
مکان نمبر ۳۴، بلاک ایم بورے والہ

ثناء اللہ عبداللہ، چہارم بی
۱۹، ستمبر ۱۹۷۸ء
اردو، کہانیاں، سوئمنگ
بزنس مین بننا چاہتے ہیں۔
۶۴، فاران سوسائٹی حیدر علی روڈ، کراچی

مظفر حسین ، نہم
۲۳، ستمبر ۱۹۷۲ء
کرکٹ کھیلنا، اسلامیات
قاری بننا چاہتے ہیں۔ گھر نمبر ۱۴
سردار کالونی حالی روڈ، حیدر آباد

رانا نگزار احمد، دہم
۲، ستمبر ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی، کہانیاں،
اسلامیات، جنگی پائیلٹ بنیں گے۔
ٹیچر کالونی علی پور منظفر گڑھ کوڈ ۳۴۴۵۰

عمران عامر ، دہم
یکم ستمبر ۱۹۷۴ء
سائنس، کرکٹ ٹیبل ٹینس
ڈاکٹر بنیں گے۔ رشید احمد چاہ بھلے والا
پرانا شجاع آباد روڈ نزد ڈبل پھاٹک

عمر خان غازی، پنجم
۱۷، ستمبر ۱۹۷۹ء
کیرم کھیلنا، حساب
فوجی بننا چاہتے ہیں۔
السید ہاسپٹل ، ایبٹ آباد

محمد عاقل احمد خان، نہم
۱۹، ستمبر ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی، اُردو، پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں۔ مسرور سویٹ ہاؤس
۴۸۱۔ شاہی بازار۔ پرانا سکھر۔

کاشف شہزاد علی، چہارم
۷، ستمبر ۱۹۷۹ء
کرکٹ کھیلنا ، انگلش
انجینئر بنیں گے۔
مکان نمبر ۱۴۱ آر ڈی بوہڑ بازار راولپنڈی

منصور احمد ، ہشتم
۲، ستمبر ۱۹۷۷ء
قلمی دوستی ، ریاضی ،
پائیلٹ بنیں گے۔
منصور احمد جماعت ہشتم کیڈٹ کالج مستونگ

شیراز خورشید ، چھٹی
۲، ستمبر ۱۹۷۸ء
مطالعہ، کرکٹ، سائنس
ڈاکٹر بنیں گے۔
۳/۴۶ شیٹ نمبر ۱۱، ماڈل کالونی کراچی

مدثر حسین نہم
۷، ستمبر ۱۹۷۵ء
مطالعہ کرنا، اسلامیات
پائیلٹ بنیں گے۔
مدثر حسین نورے والی رحیم یار خان

الیس امجد علی شاہ، ہشتم
۴، ستمبر ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی
انگلش، ڈاکٹر بنیں گے۔
نزد پوسٹ آفس ظاہر پیر سٹی۔ ضلع رحیم یار خان

عارف محمود قریشی، ہفتم بی
۲۰، ستمبر ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا، عربی انگریزی
ڈاکٹر بنیں گے۔
مکان نمبر ۴۹۸، بلاک نمبر ۲ بنک اسٹریٹ جھنگ صدر

نام ــــــــــــــ جماعت ــــــــــــــ
تاریخ ماہ و سنِ پیدائش ــــــــــــ مشاغل ــــــــــــ
پسندیدہ مضمون ــــــــ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ــــــــ
پتہ ــــــــــــــــــــــــــــ

# امّی ابّو کا صفحہ

ماہنامہ آنکھ مچولی کے آغاز کے ساتھ ہی "امّی ابّو کے صفحے" کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ گویا بچّوں کے حوالے سے والدین کے ساتھ اس تعلق کو تین سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا ہے... چونکہ امّی ابّو نے اس سلسلے کو بے حد پسند کیا اس لیے ہم نے بھی اسے ختم کرنا مناسب نہ سمجھا۔

بچّوں کے مختلف مسائل پر ہم نے ماہرینِ نفسیات سے گفتگو کی، ماہرین کے مشورے سُنے اور اس موضوع پر شائع ہونے والے مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سب کی روشنی میں امّی ابّو کا صفحہ مرتب کر کے ہر ماہ آپ تک پہنچاتے رہے۔ ہم نے اپنے تئیں ہر ممکن کوشش کی کہ بچّوں کے حوالے سے آپ کی کوئی اُلجھن ایسی نہ رہ جائے جسے سلجھانے کے لیے ہم آپ کو مشورہ نہ دے سکیں۔ تاہم اس امکان کو یکسر نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے آپ اپنے بچّے کے کسی نفسیاتی مسئلے کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوں اور ہمیں اس مسئلے کا علم تک نہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو براہِ کرم آپ آج ہی درج ذیل کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیجیے۔ ہماری پُوری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد آپ کے بچّے کے مسئلے پر ماہرینِ نفسیات سے گفتگو کرنے کے بعد آپ کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ کوپن ہمیں بچّوں کے حوالے سے ہمارے معاشرے کے اہم مسائل کو سمجھنے میں بھی مدد دے سکتا ہے۔

بچّے کا نام ____________ عُمر ________ کلاس ________

بچّے کا مسئلہ ______________________________

بچّے کے بہن بھائیوں کی تعداد ______________________

بچّے کے ابّو امّی یا سرپرست کا ذریعۂ معاش ______________

آپ کا نام پتہ ______________________________

احمد
آلو بخارے کی چٹنی
تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت
دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصاً اور صحت کے لئے عموماً انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابلِ قدر اضافہ
قدرت نے ذائقہ دیا ۔۔۔ احمد نے محفوظ کیا
AHMED
PLUM SAUCE
PRODUCE OF PAKISTAN
Net. WT. 400 g./14 oz.
FOOD INDUSTRIES (Pvt.) LTD.
احمد
لذت کو لذیذ تر بنائے

REGD. NO. M–266 SEPTEMBER 1989

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI